باسی پھول

علی عبّاس حسینی

مکتبہ اُردُو لاہور

طبع اوّل — نومبر ۱۹۳۹ء
طبع ثانی — ستمبر ۱۹۴۲ء

قیمت

عا
۱۲ر

پنجاب آرٹ پریس لاہور میں چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشر نے مکتبہ اُردو لاہور
سے شائع کی

عنوان

میں اس مجموعے کو اپنے والدِ محترم مولانا سیّد محمد صالح حسینی کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں جنہوں نے اپنے قدیم تعلیم و تربیت کے باوجود طرزِ جدید کے فسانوں کو ہمیشہ ذوق و شوق سے پڑھا اور میری قلمی کاوشوں کو استحسان و محبت کی نظروں سے دیکھا۔

علی عبّاس حسینی

فہرس

باسی پھول

وہ اپنے چھتے پر کھڑی محوِ نظارہ تھی اور میں اپنی کھڑکی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان صرف ایک دو گز چوڑی گلی تھی۔ اور دونوں کوٹھوں کے نیچے دوکانداروں اور آنے جانے والوں کا مجمع، گو اس کے کوٹھے کے سامنے چلمن پڑی تھی۔ لیکن وہ اس کے بوٹے قد، چھریرے بدن اور آفتابی چہرے کو مجھ سے نہ چھپا سکی، اس نازک اندام کے جسم پر فالسی ساری، چست ہلکا گلابی شلوکا اور پیروں میں سیاہ بوٹ تھا۔ اور اس پیکرِ رعنائی میں ایک عجیب خدا داد جذب تھا، جو میرے جیسے خشک آدمی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

دفعتاً اس نے میری جانب مڑ کر دیکھا، اس کے پنکھڑیوں سے ہونٹ کھلے۔ ایک ہلکی سی آواز ''اُوئی'' کی سُنائی دی، اُس نے جھجک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ

چھپا لیا اور گھبرا کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا جسم غصے، خوف اور شرم سے کانپنے لگا۔ میں نے غیرت سے منہ پھیر لیا اور جب پلٹ کر دیکھا تو وہ وہاں موجود نہ تھی!

جذبہ متقاضی تھا کہ میں وہیں کھڑا رہوں، حمیت کا اصرار تھا کہ یہاں سے کھسک چلو۔ جنگ سخت تھی، لیکن غیرت و شرافت کی جیت رہی اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا، بالآخر علم النفس کی کتاب کھولی، تخئیل و حسیات کا باب کھلا۔ دو چار سطریں پڑھی ہوں گی کہ جذبات کا بیان نکالا اور غور سے پڑھنے لگا۔

محبت کے وجوہ اور اُس کے اسباب پر نظر ڈالی فلسفیوں کی بحثیں دیکھیں، اس جملے کو بار بار پڑھ کر سوچنے لگا ہر شخص اپنی معشوقہ کی ایک ذہنی تصویر اپنے دماغ میں رکھتا ہے اور جب اس سے ملتا جلتا چہرہ دکھائی دیتا ہے تو وہ فطرتاً پہلی ہی نظر میں اسکی طرف کھنچ جاتا ہے۔" میں نے دل سے پوچھا "کیا میری معشوقہ سنہرے چہرے کی، غزالی آنکھوں والی ہے؟"

دِل بولا۔ "مجھے اس وقت فلسفہ یاد نہیں!"

میں نے علم النفس کی کتاب پھینکی اور تاریخ روم اٹھائی، پہلے ہی "انٹنی" اور "کلوپیٹرا" کے قصے پر نظر پڑی اور میں نے دیکھا کہ جس نیلی ناگن نے جولیس سیزر سے فاتح کو ڈس کر مدہوش بنا دیا تھا، وہ بعد میں انٹنی کے گلے کا ہار ہوئی میرے جذبات سے مملو دل پر چوٹ سی لگی، اور میں نے کتاب دور پھینک دی۔ اور ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" اٹھائی، اب جو دیکھتا ہوں تو ساری انسانی کمزوریوں کے ذمہ دار حضرت آدمؑ و حواؑ، ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، گلے میں باہیں ڈالے گیہوں کے درخت کی طرف جا رہے ہیں! میں نے

اُسے بھی غصّہ سے بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

چونکہ میری اُلجھن بڑھتی جاتی تھی اسلئے اسکے رفع کرنے کے لئے میں نے قلم دوات اور کاغذ اپنی طرف کھینچا اور اپنے دوست محمود صاحب کو خط لکھنے لگا، ابھی پانچ سطریں بھی نہ لکھی ہونگی کہ بجائے اس کے کہ یہ لکھوں کہ علامہ اقبال کا "پیامِ مشرق" بھیج دینا، "فالسی ساری گلابی شلوکا" لکھ گیا۔ میں نے گھبرا کر خط کو دیکھا، پھر اپنے ہاتھوں کو اور پھر اس حصّے کو جہاں میں تھوڑی دیر پہلے محوِ تماشا تھا، اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خط چاک کر کے پھینک دیا۔

پھر کرسی سے اٹھا اور ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پانچ منٹ اس حالت میں نہ گزرے تھے کہ میرے پیروں نے پھر مجھے اسی گوشے میں لاکر کھڑا کر دیا جہاں سے وہ چلمن نظر آتی تھی۔ میں کھڑا کھڑا چلمن کی تیلیاں گننے لگا۔ بارہا کوشش کی۔ لیکن دس بارہ سے آگے نہ بڑھ سکا جب میں تین چار گن لیتا۔ میری تخئیل چلمن کے پیچھے ایک بوٹا سا قد، فالسی ساری اور گلابی شلوکا پہنے لاکر کھڑا کر دیتی اور میں تیلیوں کی تعداد بھول جاتا، پھر شروع کرتا اور پھر ایک سنہرے چہرے پر سامنے کے دو چار ہلکے پتلے سیاہ چمکدار بال ہوا میں اُڑتے اور کانوں کے دونوں گوشوارے آہستہ آہستہ گالوں کی طرف بڑھتے اور جھکتے دکھائی دینے اور مجھے دس کے بعد گیارہ نہ یاد آتا اور میں پھر انگلیوں پر گنتا شروع کر دیتا۔

تھوڑی دیر اسی حماقت میں گزری تھی کہ دفعتاً غیرت و شرم کے ایک چھینٹے نے مجھے چونکا دیا۔ کمرے میں پلٹ کر میں نے لنگی باندھی اور کپڑے اُتار کر نل کے نیچے بیٹھ گیا

سر پر پانی جیسے جیسے پڑتا جاتا تھا۔ میرے حواس بجا ہوتے جاتے تھے۔ گویا پانی نے میرے احساسات، توہمات اور جذبات سب کو دھو دیا! تھوڑی دیر میں مجھے اتنا ہوش آیا کہ میں نے ملازم کو آواز دی اور اس سے تولیا اور دوسری لنگی مانگی اور کپڑے نکالنے کو کہا۔ کپڑے پہن کر میں نے نماز پڑھی اور امین آباد کی طرف تفریح کیلئے روانہ ہو گیا۔

امین آباد سے واپسی پر میں نے دوسرے دن کے سبق کی تیاری کے لئے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن کتابوں میں کسی طرح جی نہ لگا۔ ہر دس منٹ کے بعد کھڑکی کا طواف کر آتا لیکن جب امید بر نہ آئی تو ناکامی نے غیرت کو پھر اُبھارا اور دل پر جبر کر کے پلنگ پر پڑ رہا۔ دوسرے دن سہ پہر تک میری یہی حالت رہی۔ لیکن پانچ بجتے ہی میری جھجک دفعتاً رفع ہو گئی اور میں پھر اپنی کھڑکی پر کھڑا تھا!

سامنے کی چلمن قدرے دونوں جانب سے ہٹی ہوئی تھی تینوں پری وشیں، اپنے چاند سے چہرے لگائے، نیچے کی طرف جھانک رہی تھیں۔ بیچ میں وہی فالسی ساری والی، ہلکی ساری زیب بدن کئے کھڑی ہنس ہنس کر دونوں کو منع کر رہی تھی کہ "ارے کوئی دیکھ لیگا!" کہ اتنے میں نظر اوپر اُٹھی اور میرے چہرے پر پڑی اور اُس نے جلدی سے آنچل کو گھونگٹ نما چہرے پر ڈال لیا۔ میں آڑ میں چلا آیا۔ وہ دونوں سہیلیوں کو کھینچ کر بولی "اے نوج کوئی ایسا محو ہو جائے! وہ ذرا سامنے تو دیکھو!"

داہنی جانب والی سہیلی منہ بنا کر بولی "اے ہٹو بہن کوئی موا ہوگا۔ وہ اپنی آنکھیں

خود پھوڑتا ہے۔ہمیں کیا؟" اور پھر نیچے سڑک کی جانب دیکھنے لگیں۔

میں یہ جملہ سن کر خواہ مخواہ مسکرایا اور میں نے ڈرتے ڈرتے پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔لیکن آنکھوں کا ملنا تھا کہ اس نے منہ پھیر لیا اور وہیں اپنی سہیلیوں کے پیچھے سمٹ کر بیٹھ گئی، چہرے کا جو حصّہ دکھائی دیتا تھا اس کی سُرخی غصّہ کا پتہ دیتی تھی۔ آنکھوں میں شرم، خوف و استعجاب سب کی تھوڑی تھوڑی جھلک موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ دفعتاً ایک چھوٹے سے خوبصورت رومال سے چہرا پونچھا گیا۔ اس ادا نے میرے دل پر نشتر کا کام کیا۔ اللہ میرے دیکھنے سے عرق شرم آگیا! میں نے اس لئے کھڑکی بند کر لی اور وہاں سے چلا آیا۔

کمرے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں پھر چاقو اٹھایا اس سے میز پر کھٹکھٹایا گیا اور دل سے لڑا کیا۔ بالآخر ایک سگریٹ جلائی اور وہیں میز پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ جسم کی تشنجی کیفیت شاید پیروں میں سمٹ آئی تھی۔ اس لئے کہ وہ خود بخود ہلنے لگے۔ میں نے گھبرا کر سگریٹ کے پانچ سات کش پئے لیکن دم گھٹنے لگا۔ اس لئے سگریٹ تو میں نے جھلا کر پھینکی اور پھر سیدھا کھڑکی پر پہنچا۔ تھوڑی دیر یوں ہی چپکا کھڑا رہا۔ بالآخر نہ برداشت کر سکا اور چپکے سے کھڑکی کھولی۔ دیکھا کہ دونوں خورشیں اسے بھی کھینچ رہی ہیں کہ "صابرہ! اک ذرا تم بھی جھانک کر دیکھ لو" لیکن وہ لجا لجا کر رہ جاتی ہے۔ آخر استعجاب نے، جو زنانی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اُسے مجبور کر دیا کہ وہ بھی دونوں کے ساتھ جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔

اب تینوں مہوشیں وہیں کمرے کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں اور آنچل کا ایک حصّہ ان کی پیٹھ پر پڑا تھا۔ صابرہ ان کے بیچ میں بالکل اس طرح تھی جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند وہ اپنی دونوں کہنیاں چھتے کے فرش پر ٹیکے، دونوں ہتھیلیوں پر اپنا پیارا رخسارہ رکھے، نیچے دیکھ رہی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن کا وہ جھکاؤ اور اس کے سیاہ بالوں کی وہ چمک، جسے اس وقت ڈوبتے ہوئے آفتاب کی زرد زرد شعاعیں اور بھی چمکا رہی تھیں، ایک محشر خیز منظر تھا۔ میری حریص آنکھیں اس کے اعضا کے تناسب اور جسمانی خوبیوں کو دیکھنے لگیں کہ فطرتی کشش نے اسے میری موجودگی کی خبر دی اور اس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ اور مجھے پھر سامنے پایا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کا رنگ متغیر ہو گیا اور اُن سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ میں خوف سے کانپ کر پیچھے ہٹا تھا ہی کہ دفعتاً اس کے ہونٹوں کے کونے ہلنے لگے اور چہرے پر کچھ مسکراہٹ سی ظاہر ہوئی اور اس نے پھر میری جانب دیکھا۔ آنکھوں نے پوچھا: "کیا تم نہ مانو گے؟ کیا میں تماشا نہ دیکھوں؟" میں نے آنکھوں سے لجاجت سے پوچھا: "کیا میں چلا جاؤں؟" پھر ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی اور سہیلیوں کا شانہ پکڑ کر ہلایا گیا۔ پھر دونوں بولیں "کیا ہے؟" انگلی سے میری جانب اشارہ کیا گیا۔ دونوں ایک اجنبی کو یوں سامنے دیکھ کر جھجکیں۔ چلمن چھوڑ لی گئی اور سب کی سب کھڑی ہو گئیں۔

بائیں جانب والی سہیلی دفعتاً پلٹ پڑی اور میری طرف رُخ کر کے بولی: "کیسا

نوجوان شریفوں کا اب بھی دستور ہے کہ پرائی بہو بیٹیوں کو گھوریں؟"، میں شرم سے عرق عرق ہو گیا اور میرے ہاتھ کھڑکی کے پٹ کی طرف بڑھے اور میرے قدم پیچھے ہٹے لیکن قبل اس کے کہ میں کھڑکی بند کر سکوں، داہنی جانب والی شوخ نے مجھے جھک کر سلام کیا اور مسکرا کر بولی" لیجیئے ہم لوگ جاتے ہیں اب تو آپ کے دل کی مراد پوری ہوئی!" میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر لی ـــــ اور سامنے والے کوٹھے سے سُریلی اور پُرترنم آواز دل میں ایک ہلکے سے قہقہے کی آواز سنائی دی!

کمرے میں واپسی پر میں بہت دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا کہ قدرت نے ایک صورت میں، جو مجموعہ ہے تھوڑے سے بالوں، کچھ ہڈیوں، کچھ گوشت اور چند عدد ناخن کا، اور جو مشرقی فلسفیوں کے نظریئے کے مطابق مٹی پانی۔ ہوا اور آگ سے بنائی گئی ہے۔ اس بلا کی دلآویزی کیونکر ودیعت کر دی ہے، نہ تو دائرے درست ہیں۔ نہ سطح برابر ہے، نہ خطوط متوازی ہیں اور نہ مستقیم اور پھر اتنی دلفریبی! جتنا ہی میں انسانی اعضا۔ ان کی ساخت اُن کی اقلیدسی شکلوں پر غور کرتا تھا۔ اتنی ہی میری حیرت بڑھتی جاتی تھی۔

میں نے تحقیق کے لئے علم التشریح کی ایک کتاب اٹھائی اور آنکھوں کا بیان پڑھنا شروع کر دیا۔ مصنّف نے آنکھوں کے پردے، ان کی رگوں کی باریکیاں اور نزاکتیں سب کے متعلق بہت ہی تحقیق کی تھی لیکن اس نے کہیں یہ نہ لکھا تھا کہ غصے میں ان سے شعلے کیوں نکلتے ہیں۔ رنج میں اُن کی آب و تاب کہاں چلی جاتی ہے، اور محبت میں اُن کی

سیاہی اور گہرائی کیوں بڑھ جاتی ہے، اُن کے اشارے دشنہ و خنجر اور اُن کی غلط انداز نگاہیں تیرِ نیمکش، کیوں بن جاتی ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محقق فلسفہ جذبات سے بالکل نابلد تو تھا ہی اُس کے ساتھ ہی اس نے سوائے کتابوں اور سوکھے مُردوں کے کبھی کسی چینی جاگتی توبہ شکن عورت سے محبّت بھی نہیں کی تھی!

میں نے اس کی مدلّل مگر بے نمک تحریر سے تھک کر کتاب رکھدی اور پھر ایک نئے سوچ میں گرفتار ہوگیا۔ قابل غور یہ امر تھا کہ کیا مجھے اس صورت سے جو چلمن کی پشت سے جلوہ نمائی کرتی ہے۔ محبّت ہے؟ مجھے اس خیال پر ہنسی آئی، میں نہ تو ایسا چھچھورا تھا اور نہ اتنا بیوقوف کہ حُسن کی دیوی کو بھی دو بار دیکھنے کے بعد یہ خیال کرنے لگوں کہ اس سے محبّت ہوگئی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ تھا تو پھر بے چینی کا ہے کی تھی؟ مجھے کل سے نہ تو اپنے کھانے کا خیال تھا اور نہ اپنے پڑھنے کا۔ دن میں کالج تو گیا تھا۔ لیکن پروفیسروں کے لکچر کے درمیان اکثر یہ خیال ہوتا تھا جیسے کوئی فالسی ساری پہنے منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ اور میرے ذہن سے کتاب کے معانی و مطالب سب معدوم ہو جاتے تھے، میرے ساتھی ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے اور درمیان گفتگو میں ایک سریلی پیاری آواز میں "اُوئی" کا لفظ سنائی دیتا تھا اور میری آنکھوں سے مسرّت غائب ہو جاتی تھی۔

کالج سے آکر میں شیروانی اُتارنے لگا تو مجھے شبہ گزرا کہ میری قمیص کا رنگ بھی فالسی ہے، شک رفع کرنے کیلئے میں نے ملازم سے پوچھا، وہ گھبرا گیا اور جلدی سے شربت کا ایک گلاس برف دیکر لے آیا میں نے پوچھا کہ "یہ کیا ہے؟" وہ کہنے لگا: "میاں آپ ابھی دھوپ

سے چلے آتے ہیں اس وجہ سے فوراً اسے پی لیجئے۔ پھر آنکھوں کی چکاچوند جاتی رہے گی۔ میں نے ایک حسرت بھری مسکراہٹ سے اُسے دیکھا اور چپکا شربت پینے لگا۔ اگر کہیں میں اس سے یہ کہہ دیتا کہ شربت کا رنگ بھی فالسئی ہے تو وہ ڈاکٹر کو ضرور بلا لاتا اور میری اصلاح دماغ کی فکر کئے بغیر نہ رہتا اسلئے میں نے سکوت کیا اور دل میں اسکی اور اپنی حماقت پر زہرخندہ کرتا رہا۔

اپنی حالت پر شب کو اُردو کی ایک مثل یاد آئی "ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سُوجھتا ہے" اور میں بہت دیر تک ہنسا کیا۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی سے کام لیکر ان خیالات کو اپنے دل سے نکالا اور نیند بلانے کیلئے تارے گننے لگا۔ دفعتہً زہرہ پر نظر پڑی، نام یاد آتے ہی صابرہ کی آنکھیں یاد آگئیں اور زہرہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اس کی چمک دمک اسکی خنکی اور قوتِ خیرگی سب جاتی رہی۔ میں نے اپنی کمزوری پر لاحول بھیجی اور کروٹ لے لی۔ مجھے اپنے پر سخت غصہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے اس نئے رنگ سے نفرت سی ہو چلی تھی۔ میں اس خبط پر خفا ہی ہو رہا تھا کہ کھڑکی کی طرف سے ایک پُر ترنم قہقہے کی آواز آئی۔ سارا فلسفہ ہوا ہو گیا۔ ساری خودداری جاتی رہی اور میں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

اس وقت چلمن اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں قالین پر ایک سپید دسترخوان بچھا ہوا تھا اور اس پر طرح طرح کی نعمتیں چنی ہوئی تھیں، دسترخوان کے دونوں پہلوؤں پر دونوں سہیلیاں اور بیچ میں صابرہ بیٹھی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ قہقہہ میرے بلانے کے لئے تھا۔ اس لئے کہ میرے آتے ہی تینوں نگاہیں ایک ساتھ اُٹھیں، دو بجلیوں نے مجھے دو جانب سے گھیر کر بے بس کر دیا اور تیسری بجلی دل برماتی ہوئی جگر کے پار ہو گئی۔

سہ پہر والی شوخ نے ایک نیم خندہ سے دستر خوان کی طرف اشارہ کیا اور بولی "کھانا حاضر ہے۔" میں بے تکان بول اٹھا۔ "آپ کے پوچھنے کا شکریہ لیکن میں تو خونِ جگر کھاتا ہوں وہ یہاں موجود نہیں!" دوسری بولی "اے نوج یہ بھی بھلا کوئی کھانے کی چیز ہے؟" صابرہ کے چہرے پر سُرخی جھلک آئی اُس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔

چونکہ تینوں میرے جواب کی منتظر معلوم ہوتی تھیں اسلئے میں نے کہا۔ "اجی اس کا مزہ کچھ کھانے والے ہی جانتے ہیں، نہایت ہی تلخ اور نہایت ہی شیریں!"

پہلی شوخ نے چمک کر کہا۔ "جی ہم لوگوں کو تو معاف رکھئے اخدا آپ ہی کو مبارک کرے!" میں نے عرض کیا "میری تو دعا یہی ہے کہ آپ لوگوں کو خدا اس نعمت سے محروم ہی رکھے!"

دوسری صاحبہ بول اٹھیں "یہ آپ کی محبت ہے!" جواب میرے لبوں تک آچکا تھا، کہ صابرہ نے میرے مخاطب کے اس زور سے چٹکی لی کہ وہ بیچینی سے اُف کر کے پلٹ پڑی اور صابرہ نے معلوم کیا چپکے سے کہا کہ تینوں نے ایک قہقہہ لگایا، وہ میری طرف دیکھتی جاتی تھیں اور ہنسی بڑھتی جاتی تھی، میں اپنی جھینپ مٹانے کے لیئے کچھ کہنے والا تھا ہی کہ ایک ماما کی جھلک دکھائی دی اور میں اپنی کھڑکی کے سامنے سے کھسک آیا۔ تھوڑی دیر میں وہ اندر واپس چلی گئی اور میں کھڑکی پر پھر آموجود ہوا۔

مجھے دیکھتے ہی ایک شوخ بول اٹھی "اجی میاں ہمسائے آپ بڑے بھوکے معلوم ہوتے ہیں" میں نے کہا۔ "جی ہاں طالب علم ہوں اس پر گدائے حسن!"

وہ بولی۔ "جی ہاں جب ہی تو آپ کسی کو نگاہوں نگاہوں میں کھائے جاتے ہیں۔"

صابرہ نے پھر ایک چٹکی لی اور دونوں کھل کھلا کر ہنسنے لگیں۔

میں نے جواب دیا کہ "آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ پیٹ نہیں بھرتا، دل بھر آتا ہے!"

صابرہ نے میری طرف شرماتے ہوتے دیکھا گنگاہوں میں ندامت و غیرت بھری تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ "للہ اب یہاں سے چلے جاؤ، کیوں میری رسوائی کراتے ہو؟"

میں نے دل پر جبر کیا۔ متانت سے سر جھکایا آنکھوں سے کہا "جیسا حکم!" اور کھڑکی بند کر کے چلا آیا۔

کئی ہفتہ اسی طرح کے نظارے اور مکالمے میں گزرے اور بےچینی و اضطراب میں روز بروز زیادتی ہی ہوتی گئی۔ بالآخر ایک دن صبح کو میں نے دو جوڑے کپڑے اور کچھ کتابیں "ہینڈ بیگ" میں رکھیں اور بارہ بنکی اپنے دوست رضا علی صاحب کے یہاں چلا آیا۔ لکھنؤ سے آنا محض اُن سے ملنے کی غرض سے نہ تھا اور نہ بارہ بنکی میں کوئی ضروری کام تھا، یہ صرف تقاضائے شرافت تھا یا یوں کہئے کہ عقل لے بھاگی تھی۔ یا یوں سمجھئے کہ حضرتِ دل کی نذر کا معاوضہ لینا منظور نہ تھا۔

میں رضا علی صاحب کے یہاں تین روز تک مقیم رہا، جہاں تک ہو سکا میں نے دل بہلانے اور دنیا کے بہترین رنگ کے بھول جانے کی کوشش کی۔ چوتھے روز بارہ بنکی سے پھر پلٹا۔ جب اپنے محلے کی گلی میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ معمول سے زیادہ ہجوم ہے اور

کچھ باجوں کے بجنے کی آواز آرہی ہے۔ میں نے اس وقت جلدی میں اس پر دھیان نہیں دیا، اور ملازم کو آواز دیتا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نہا دھو کر جب ذرا سفر کا تکان رفع ہوا اور میں آدمی بنا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے کوئی خاص قوت کھڑکی کی جانب کھینچ رہی ہے اور میں اپنی حماقت پر افسوس کرتا، پیچ وتاب کھاتا، لیکن بے بس کھڑکی پہ آیا۔

سامنے چلمن پہ آج پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ اور کمرے میں ہر طرف پھول ہی پھول دکھائی دیتے تھے۔ گلدستے گلدانوں میں، بڑے بڑے ہار دیواروں پر، گلوں میں بدھیاں، جوڑوں میں گلاب کے پھول! غرض ہر طرف بہار ہی بہار تھی۔ میری نگاہیں صابرہ کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ کہ دفعتاً ایک چمکتی سی چیز نظر پڑی۔ غور سے دیکھا تو صابرہ زرد چمکتے ہوئے کپڑے پہنے ہے اس کے حنائی ہاتھوں میں نئی طرح کے گوٹے کے کنگنے ہیں اور وہ پھولوں سے لدی سمٹی سمٹاتی بیٹھی ہے۔

اُف! بلا کی دلربائی تھی۔ اس کے گورے رنگ پہ وہ زرد وزرد چمکتا ہوا جوڑا! اس پر اس کی شرمائی ہوئی بھولی صورت! میری آنکھیں خیرہ ہونے لگیں اور میں ایسا محو نظارہ ہوا کہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس طرح کی خوشی اور ایسے جوڑے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، اتفاقاً مجھے میری مہربان شوخ نے دیکھ لیا۔ نہ معلوم اس غریب کو میری صورت دیکھ کر کیا یاد آیا کہ اُس نے سب اجنبی چھوکریوں کو وہاں سے مختلف بہانوں سے نکال دیا۔ اب صرف وہ اور صابرہ رہ گئیں۔ تنہائی ہوتے ہی اُس نے نہایت دعوے سے پوچھا، کیوں ہمسائے صاحب،

یہ آپ تین دن کہاں غائب رہے ؟" مجھے اصلی سبب بتانے کچھ شرم آئی لیکن میں نے جھینپتے جھینپتے کہہ ڈالا کہ" اپنے خیالات سے بھاگ کر بارہ بنکی چلا گیا تھا!"

صابرہ نے مجھے ایک ایسی نگاہ سے دیکھا جس سے خجالت اور ہمدردی ظاہر ہوتی تھی، لیکن ایک نئی طرح کی جھلک بھی تھی، نہ معلوم وہ درد تھا یا غم . . . . . . یا . . . . . . یا محبت تھی! . . . . . وہ چپکے سے بولی:" بہن نورجہاں جانے بھی دو۔ کیوں بیچارے کو خواہ مخواہ ستاتی ہو؟" نورجہاں نے اسے ہنس کر دیکھا اور زور سے بولی:" جی ہاں۔ ہیں بھی یہ قابلِ رحم! بہن ایسے مردودوں کی یہی سزا ہے؟"

میں نے لجاجت سے پوچھا:" آخر میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

نورجہاں بولی:" آنکھ ہوتے اندھے بنے۔ دھکتے ہوئے انگاروں میں پھاندے۔ اب جلو!" میں نے کہا کہ" ہائے یہ تو ازل ہی سے مقدر تھا۔ اس معاملے میں تو میں اتنا ہی قصوروار ہوں جتنا پروانہ! لیکن آپ اطمینان رکھیں میں شکایت نہیں کروں گا۔

شمعم کہ جاں گدازم و دم بر نیاورم"

یہ میں نے کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں کہا کہ ان کافروں کا بھی دل پسیج گیا۔ صابرہ نے مجھے اس طرح دیکھا کہ جیسے وہ معذرت مانگ رہی ہو اور نورجہاں نے لب کھولے مگر کچھ کہا نہیں۔ بلکہ صابرہ کا شانہ پکڑ کر زبردستی اور باصرار کھڑکی پر لاکر کھڑا کر دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اچھی طرح دیکھا۔ اس طرح دیکھا کہ نورجہاں ہمارے چہرے دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی!

تھوڑی دیر دونوں جانب عجیب طرح کا سکوت رہا، اس کے بعد میں نے بات ٹالنے کے لئے پوچھا "آج یہ ماشاء اللہ چہل پہل کاہے کی ہے اور کمرہ چمن کیوں بنایا گیا ہے؟" نورجہاں نے منہ پھیر لیا اور صابرہ کانپ کر بیٹھ گئی۔ میرا استعجاب اور زیادہ بڑھا اور میں نے پوچھا "کیا میں نے کوئی بے موقع بات پوچھ لی؟"

نورجہاں کے ہونٹ ہلنے لگے اور چہرے پر رنج کے آثار صاف نمایاں ہو گئے۔ صابرہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور اس کے شانے ہلنے لگے۔ میں گھبرا گیا اور میں نے نورجہاں سے کہا "نورجہاں بہن! اللہ کچھ تو بولئے آخر معاملہ کیا ہے؟"

نورجہاں کے سینے پر پڑا ہوا آنچل کا پلو اور بھی متحرک ہوا اور اس نے اس کے ایک کونے سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ میں نے کانپ کر پوچھا "کیا میرے صبر و تحمل کا امتحان منظور ہے؟ آخر آپ دونوں صاحبوں کی میرے سوال پر یہ حالت کیوں ہوئی؟" نورجہاں دفعتاً پلٹ پڑی اور رُک رُک کر خجالت بھری آواز میں بولی "آپ کی...... صابرہ...... کی...... شادی...... ہے" میں نے یہ تو ضرور دیکھا کہ صابرہ کے شانے کو اور زیادہ حرکت ہونے لگی لیکن جو کچھ نورجہاں نے کہا میں اسے مطلقاً نہ سمجھ سکا۔ اسلئے میں نے پھر پوچھا "کیا؟"

نورجہاں نے مجھے گھبرا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ہمدردی اور حسرت ٹپکی پڑتی تھی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر صابرہ کا کاندھا آہستہ سے تھپک کر بولی "ان کے سہرے کے پھول کھلے ہیں...... اور یہ...... پروان چڑھنے والی ہیں!"

میری زبان سے نکلا "ان کی...... شادی...... ہے؟" اور نورجہاں کے گردن

ہلا دینے پر ایک تیر کلیجہ سی پار ہو گیا۔ کچھ چکر سا آیا اور میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور اندھوں کی طرح ادھر اُدھر ٹٹولتا رہا۔ ہاتھ میں کھڑکی کی چوکھٹ آ گئی اور میں نے اُسے اتنی زور سے پکڑا کہ لکڑی ہتھیلی میں چبھ گئی۔ ایک منٹ . . . . یا ایک ہزار برس . . . . . بعد میں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ صابرہ اور نورجہاں دونوں میری تکلیف پر حد درجہ مضطرب ہیں اور صابرہ کا چہرا بالکل زرد ہو گیا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے تار جاری ہیں۔ مجھے اس اضطراب نے مجھے با حواس بنا دیا۔ میں دیوار کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا اور میں نے صابرہ سے پوچھا" عقد کب ہے ؟"

وہ بولی" پرسوں شب کو !"

میں بےساختہ کہہ اُٹھا" ہائے اتنی جلدی !"

پھر دونوں جانب تھوڑی دیر سکوت رہا . . . . . دفعتاً مجھے اپنی قسمت پر غصہ آیا اور میری کمزوریاں رفع ہونے لگیں میں نے کوشش کر کے پوچھا" یہ خوش نصیب صاحب کون ہیں ؟"

صابرہ کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے اور وہ کچھ پیچھے ہٹی، مجھے اس کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں سے چلی جانا چاہتی ہے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا اور نورجہاں کی طرف پھر کر سوالیہ انداز سے دیکھا۔

وہ بولی" ایک نواب صاحب ہیں ماشاء اللہ کئی سو کے وثیقہ دار ہیں !"

مجھ سے صبر نہ ہو سکا بےساختہ بول اُٹھا" اور ماشاء اللہ خاندانی رنگ میں گرفتار ہو نگے ! چانڈو، افیون، بٹیر اور مرغ !"

نورجہاں نے مجھے روکنے کے لئے غصّہ سے دیکھا۔ اس نظر نے تازیانہ کا کام دیا۔ میں نے زہر خندہ کر کے کہا۔ "آپ کا غصّہ بیکار ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں۔ اگر جوان ہونگے تو ان شوقوں کے علاوہ اور بھی اشغال ہوں گے۔ مثلاً چوک کا جانا۔ غزلیں گانا۔ ماماؤں کو گھور گھور کر ٹھنڈی سانسیں بھرنا! اور اگر عمر ڈھل چکی ہے تو پانچ چار بچے ہوں گے اور اس سے زائد محل!"

نورجہاں سے صبر نہ ہو سکا بول اُٹھی۔ "آخر ہم لوگوں کے رنج کا کچھ خیال ہے، یا بس دنیا میں آپ ہی کو تکلیف ہوتی ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں آپ کو بڑا رنج ہوگا! آپ ابھی ہمجولیوں میں پہنچتے ہی ڈھولک لیکر بیٹھ جائیں گی گانے گائیں گی، پھبتیاں کسیں گی اور دھول دھپا کرینگی! آپ اور رنج۔ لاحول ولا . . !"

نورجہاں نے بات کاٹ کر کہا۔ "ارے میں اپنے کو نہیں کہتی۔ صابرہ پر تو رحم کرو!"

میں نے جواب دیا۔ "جی . . . . . وہ قابلِ رحم ہیں بالکل شادی ہوگی، پرسوں رنگ رلیاں منائیں گی (صابرہ کی آنکھیں غصّہ سے سُرخ ہوگئیں اور اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹالئے) ایک سوکھے مولوی نما طالب علم کے رنج سے۔ اس کی آرزوؤں کے خون ہونے اور اس کی زندگی کے ملیامیٹ ہونے سے انھیں کیا مطلب! یہ ہونگی اور پھولوں کی سیج مخملی گدے اور نواب صاحب کا پہلو!" میرا غصّہ بڑھتا ہی جاتا تھا، مجھے صابرہ کے اُترتے ہوئے چہرے پر بھی رحم نہیں آتا تھا، مجھے جا بیجا الفاظ کے استعمال میں تفریق کا بالکل خیال نہ تھا۔ میرے مُنہ میں جو کچھ آتا تھا بکے چلا جاتا تھا۔ نہ معلوم ابھی اور کیا کچھ کہتا کہ نورجہاں نے صابرہ سے کہا۔ "آؤ بہن چلو۔ یہ اسوقت اپنے حواس میں نہیں ہیں، نہ جانے کیا بک رہے ہیں!" میں نے بھی کہا۔ "جی ہاں یہی بہتر ہے

خدا حافظ!" اور کھڑکی بند کر کے اپنے پلنگ پر آ کر پڑ رہا۔

گو رات بھر بےچینی اور تکلیف سے نیند نہیں آئی لیکن صبح تک غصہ رفع ہو گیا اور مجھے اپنی بیجا جھلاہٹ پر بیحد ندامت تھی۔ عقل نے صابرہ کی بےبسی دکھلا کر ہندوستانی قدامت کے معنی اور ریت اور رسم کی پابندی بتلا کر بہت کچھ تسکین دی اور سچ پوچھو تو خودداری نے بڑا ساتھ دیا، ورنہ دل نے مجھے کہیں کا نہ رکھا ہوتا۔ جذبات کا طوفان حسرتوں اور نا امیدیوں کا سیلاب عزت و حمیت کے مستحکم قلعہ کو جنبش نہ دے سکا۔ اس لئے کہ اس کا قول تھا کہ عشق ناکام عشق کامل ہے۔ وصل عارضی ہے لطف دم بھر کا ہے عیش و عشرت فانی ہے۔ ہاں اگر کسی چیز کو بقا ہے تو وہ درد ہے ٹیس ہو یا ہوک یہ بوالہوسی کی علامتیں ہیں اور چشم زدن کی باتیں لیکن درد۔ دل کا درد یہ زندگی کے ساتھ ہے بلکہ انسان کو ابدی البقا بنانے والا ہے! ..... صبر و تحمل مرد کے جوہر ہیں اگر اس وادی میں پیر ڈگمگایا تو پھر اس میں مردانگی نہیں: غیرت نہیں، شرافت نہیں!

میں نے ایک موقع پر نور جہاں سے کہا تھا کہ "شمعم کہ جاں گدازم و دم بر نیاورم!" زبان کا پاس یہی کہتا تھا کہ جو کچھ کہا ہے اسے نباہوں، جو کچھ منہ سے نکل گیا اسے کر کے دکھا دوں، اس اصرار نے میرے کمزور دل و دماغ میں جان ڈال دی اور میں صبح کی نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے کر کے کھڑکی کے پاس آیا کہ صابرہ سے اپنی رنجیدہ باتوں کی معافی مانگ لوں اور اسے ایک نظر جی بھر کر دیکھ لوں۔ کھڑکی کھولی تو تنہا نور جہاں جانماز پر دکھائی دی۔ میں نے اشارے سے اسے قریب بلایا اور کہا "نور جہاں بہن۔ میں نے جو کچھ رات غصہ میں کہا اسے بھلا دو۔ میں

اپنے حواس میں نہ تھا۔"

وہ شوخ مسکرا کر بولی "یہ تو مشتے بعد از جنگ ہے!"

میں نے کہا "جی ہاں۔ اسی لئے تو اپنے کو موت سے زیادہ سخت سزا دے رہا ہوں۔"

وہ بولی "ہائے رے بھولا پن! ارے نادان میں اپنے کو نہیں کہتی۔ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے، میں تو اس کو کہہ رہی ہوں جس کے دل پہ رات چھریاں چلیں، جس کے ہرے زخم پر نمک چھڑکے گئے!"

میں نے لجاجت سے کہا "اچھی بہن اتنی اور عنایت کرو کہ ان کو ایک مرتبہ اور یہاں لے آؤ! شاید میں زخموں کے بھرنے اور ان کے اندمال کی بھی صورت کر سکوں!"

وہ شوخ سرملاتی اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد...... صابرہ شرماتی ہوئی آئی...... لیکن تنہا!...... میں ساکت کھڑا اُسے دیکھتا رہا اور وہ نظریں نیچی کئے سر جھکائے اس طرح کھڑی رہی جیسے کوئی کنیز اپنے آقا کے حکم کی منتظر ہو...... اُف!!!

میں نے بمشکل اُچھلتے ہوئے دل پہ قابو حاصل کیا اور حلق اور تالو کی خشکی ہونٹ چاٹ کر رفع کی اور کہا "صابرہ! میں نے رات...... تم کو معلوم کتنا دکھ دیا! میں اس وقت اس لئے آیا ہوں کہ تم...... مجھے جو سخت سے سخت سزا دے سکو...... میں اس کا اپنے کو مستحق ثابت کر دوں!"

اُس نے مجھے ایک غم آلود نگاہ سے دیکھا اور بولی "ہم اور آپ دونوں مجبور ہیں۔ ہماری زندگیاں دوسرے کے ہاتھوں میں ہیں، لیکن جو کچھ رات آپ نے کہا آپ کو اس کا حق تھا اور

میں اس کی مستحق تھی!"

اس انکسار پر میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے منہ پھیر لیا اور یوں کہہ چلایا" صابرہ! صابرہ!! ...... ہائے کتنا پیارا نام ہے ...... ہاں تو خواہ تم نہ مانو ...... لیکن میں نے رات بہت کچھ ناروا باتیں کہیں ...... میں تم سے نہایت عاجزی سے معافی مانگتا ہوں۔ ان باتوں کو بھول جاؤ وہ ایک سودائی کی بک جھک تھی! لیکن ہائے جب سے میں نے تم کو دیکھا ہے میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے میں نے لاتعداد حسین و خوشنما خیالی محل بنائے اور تم کو اُن میں ملکہ کی طرح بٹھایا ...... دیکھو میں پھر بہک چلا ...... ہاں تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ...... یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہے ...... کل سے تم کسی اور کی ...... ہو جاؤ گی اور میرے لئے صرف بہن! لیکن اس کا یقین رکھو کہ میں دُکھ میں رہوں یا سُکھ میں ...... تمہارے لئے ہر وقت یہی دعا کرتا رہوں گا کہ تم سے رنج اتنا ہی دور رہے جتنی کہ آفتاب سے سیاہی! خدا تمہیں طرح طرح کی خوشیاں دے اور تمہارے دن ہمیشہ عیش و آرام میں کٹیں!"

صابرہ نے روتے ہوئے مسکرا کر پوچھا "یہ سب تو میرے لئے ہے اور آپ!"

میں نے کہا کہ "میں؟ میری زندگی تمہاری خوشی! میرا چین تمہیں سکھ میں دیکھنا ہے! میری سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ خدا کرے تم مجھے بھول جاؤ! نہ کبھی تمہیں یہ میری منحوس صورت یاد آئے اور نہ کبھی آج اور کل کی باتیں" صابرہ نے مجھے ایک ایسی نگاہ سے دیکھا کہ میں لاجواب ہو کر ساکت ہو گیا ...... پھر میرے دل میں ایک آرزو پیدا ہوئی اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل پڑی:

صابرہ میری تمنا ہے کہ میں تمہیں وہی فالسئی ساری پہنے ایک بار اور دیکھ لوں۔۔۔۔۔ گو یہ مقتضائے شرافت نہیں۔ لیکن شاید یہ میری آخری خواہش ہو گی!" صابرہ نے پوچھا۔
"آخری کیوں"

میں نے کہا:" اس لئے کہ پھر کل سے ایسی خواہش تم سے نہیں کی جا سکتی!"

صابرہ چپکی تھوڑی دیر مجھے۔۔۔۔ پیار سے؟۔۔۔۔ دیکھا کی اور اس کے بعد اندر چلی گئی۔ پانچ سات منٹ بعد وہی فالسئی ساری اور گلابی شلوکہ پہنے پھر آکر کھڑی ہو گئی۔ میں بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اور اس تصویر کو دل پر نقش کر کے کانپتے ہاتھوں سے اسے سلام کر کے بولا:" صابرہ!۔۔۔۔ جان و دل سے عزیز صابرہ رخصت!۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے رخصت۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔ دنیا جہان کی خوشیاں اور نعمات الٰہی تمہیں ہمیشہ گھیرے رہیں!"

صابرہ مبہوت بنی چشم پُر آب سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھا کی۔ میں اس تصویر کا خزانہ دل میں لئے کمرے کی طرف پلٹا لیکن تھوڑی ہی دور چلا ہوں گا کہ پلٹ پڑا اور صابرہ سے بولا:۔
مجھے اپنی بدھی کا ایک پھول دے دو۔ میں اسے حرز جان بناؤں گا!"

صابرہ میری آواز سن کر چونکی اور ایک ٹھنڈی سانس لیکر اس نے بدھی اتارنی چاہی
میں نے کہا:" نہیں۔ صرف ایک مرجھایا ہوا پھول!"

اُس نے ایک مرجھایا ہوا پھول بدھی سے نکالا لیکن میری طرف کچھ عجیب طرح سے دیکھتی گئی اور اس کی ایک ایک پتی نوچ نوچ کر پھینکتی گئی اور پھر اُس نے ایک مرجھائی کلی نکالی اور ایک

کاغذ پر کچھ لکھ کر اور کلی اُس میں لپیٹ کر میری جانب پھینک دی۔ میں نے کاغذ کھولا تو اسمیں لکھا تھا "صابرہ کا بن کھلا غنچۂ دل"! میں نے کاغذ اور کلی دونوں کو سمیٹ کر ہاتھ میں دبا لیا اور اسی ہاتھ سے اپنا زخمی دل تھام لیا اور اس سے کہا "خیر! زندہ رہو! .... لیکن خدا نہ کرے تمہارا غنچۂ دل یوں مرجھائے! .... اچھا صابرہ خدا حافظ .... جاؤ .... میرے سامنے یہاں سے چلی جاؤ!"

صابرہ نے مجھے ایک منٹ تک بغور دیکھا .... اس ایک نظر میں ماضی و حال و مستقبل کے احساسات و واقعات سب کی ایک جھلک موجود تھی! .... دفعتاً اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی مڑ مڑ کے مجھے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی!

میں نے صابرہ کی مرجھائی بن کھلی کلی آنکھوں سے لگائی۔ اسے ڈرتے ڈرتے پیار کیا پھر دیر تک اس کی خوشبو سونگھتا رہا .... اسی حالت میں کھڑکی بند کی .... چکر سا آیا .... اور وہیں فرش پر بیہوش ہو کر گر پڑا۔

صابرہ کے عقد کو آج پانچ برس ہو چکے ہیں ہمارے ہاں ریت اور رسم کی پابندیاں ابھی اسی طرح قائم ہیں۔ ہندوستانی معیارِ شرافت اب تک زنجیر پا ہے۔ اس لئے اُس دن کے بعد سے پھر میں نے اُسے نہیں دیکھا لیکن دلوں کے ناسور اور زخم کی گہرائی کی کیفیت کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ ہر سال عقد کی تاریخ کو میرے پاس کھڑکی کی طرف سے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک مرجھائی بن کھلی کلی پھینک دی جاتی ہے اور میں اُسے اس کی ہمجنسوں کیساتھ صندوق

میں بند کرتا جاتا ہوں۔ دوست احباب نے اگر کبھی دیکھ لیا اور پوچھا کہ "بھئی یہ کلیاں کیسی ہیں؟"
تو میں اُن سے یہ کہہ دیتا ہوں کہ یہ تابوت کے پھول ہیں!" لیکن اُن میں سے کسی کو یہ نہیں
معلوم کہ یہ تابوت میری زندگی بھر کی تمناؤں اور امیدوں کا ہے اور یہ پھول وہی چڑھاتا رہی۔
جس نے ہماری معاشرت کا آلہ کار بن کر ان کا خون کیا!..... عجب نہیں کہ غنچوں کا یہ ڈھیر
قبر میں میرے ساتھ ہو اور محشر کے دن جب یہ کلیاں پھول لیں اور ان میں بہار کی تازگی پھر آجائے
تو میں ان کا ہار گلے میں ڈالے مستوں کی طرح جھومتا کسی کو تلاش کرتا پھروں..... لیکن ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے!

باسی پھول

حصّہ دوم

صابرہ کو رخصت کئے ہوئے سات برس کا زمانہ گذر چکا تھا، میں بھی نوجوانی کی حدود کو پار کر گئے اور طالب علمی کی بے فکری کو خیرباد کہہ کے، اب ایک ذمہ دار انسان کی طرح اور ایک باقاعدہ وکیل کی حیثیت سے دن بھر کچہریوں کی خاک چھانتا اور بارہ بارہ بجے رات تک، صابرہ کی یاد میں نہیں، بلکہ محض قانون حفظ کرنے، اور نظیریں ڈھونڈھنے کے لئے لیمپ جلائے، اپنے دفتر میں بیٹھا کام کیا کرتا تھا۔ میں یہ ہرگز دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ صابرہ کی یاد مجھے اب بھی ستاتی تھی، اس لئے کہ امتدادِ زمانہ نے دل کو اس تکلیف سے اس قدر مانوس بنادیا تھا کہ اب الم کی جگہ لذت محسوس ہوتی تھی۔ سن کے بڑھنے کی وجہ سے اعصابی ہیجان مفقود، اور جذبات کا مدوجزر معدوم ہو گیا تھا۔ گویا چشمۂ محبت میں، برساتی مدوجزر کی جگہ، اب موسم گرما کی سبک و نرم روانی تھی، ہیجان و ہوسناکی کے خس و خاشاک تہ نشین ہو چکے تھے اور طغیان

وطوفان کی جگہ صفائے قلب و استواری وفا نے لے لی تھی۔ اگر دل میں درد تھا تو وہ بالکل ویسا جیسا کہ محنتِ شاقہ سے اعضا میں پیدا ہو جاتا ہے اور جس کی وجہ سے جسم کے دبانے میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے، اس درد کو جوڑوں کی اس چوٹ سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں جو پُروائی میں چمک اُٹھتی ہے، صابرہ کی یاد کے لیئے پُروائی کا کام وہ مرجھائی ہوئی کلی کرتی تھی، جو اب بھی، ہر سال عقد کی تاریخ کو، میرے پاس پُرزے میں لپٹی ہوئی بھیج دی جاتی تھی، ان دنوں اس پُرزے کی جگہ دو خطوں نے لے لی تھی۔ ان دونوں خطوں میں اظہارِ خلوص کے ساتھ ساتھ اس امر کی نصیحت کی گئی تھی کہ مجھے اب جلد سے جلد شادی کر لینا چاہیئے اور آخری خط میں متاہلی کے فرائض کی انجام دہی کی آمادگی بھی ظاہر کی گئی تھی!

میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھے شادی کے نام سے نفرت نہ تھی اور نہ اب مجھ میں صابرہ کے متعلق وہ والہانہ کیفیت باقی تھی کہ میں سوائے اس کے کسی دوسرے کے ساتھ اس ذکر ہی کو ناپسند کرتا، لیکن پھر بھی صابرہ کی طرف سے اس امر کی سلسلہ جنبانی، بجھتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھی۔ غور کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ عورت جو شوہر، اولاد، اور خانہ داری کے علائق میں گرفتار ہونے کے باوجود، ہر سال میری محبت کی یادگار مناتی رہے، جب میرے لیئے رفیقِ تنہائی کی تلاش کا کام بھی اپنے ذمہ لے اور خود کوشش کرے تو اس کی اس نئی عنایت سے دل میں جذبۂ امتنان بڑھے گا، یا نہیں، اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگا یا نہیں؟ صابرہ کی محبت کو اگر کوئی شے پھر اس کی پچھلی صورت میں لا سکتی تھی، تو اس کی یہ تحریک تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس آخری خط کے پانے کے بعد، میں اپنے میں وہی

والہانہ کیفیت پانے لگا، جو آٹھ برس پہلے مجھ میں موجود تھی۔ گویا آتشِ محبّت کی بجھتی ہوئی چنگاری کو، جو علائق کے خاکستر میں دبی پڑی تھی، صابرہ نے پھر اپنے ہاتھوں ایک شعلہ جوّالہ بنا دیا۔ میں سات دن متواتر شب و روز اس آگ میں جلتا رہا۔ بالآخر آٹھویں دن میں نے صابرہ کے خط کا جواب بھیجا اس خط میں میں نے، خدا جانے کتنی قسموں کے ساتھ اپنے اس عہد کو دہرایا تھا کہ میں اب تمام عمر یوں ہی بن بیاہا رہونگا اور خط ختم اس فقرے پر کیا تھا کہ "مجھے تاہل کی زندگی سے اپنی یہی زندگی پسند ہے جب اتنی فرصت ہے کہ :۔ ع

بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کیے ہوئے!"

صابرہ نے جو اس کا جواب لکھا تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے، اس لیئے اس کی نقل بآسانی ممکن ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

میرے دیوانے! آپ کا خط ملا۔ اسے پڑھ کر مجھے جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ رنج ہوا دنیا میں بھلا کون سی عورت ہے، جسے اس یقین سے خوشی نہیں ہوتی کہ اس سے ایک شریف تعلیم یافتہ مرد محبت کرتا ہے اور وہ بھی شریفوں کی طرح محبت کرتا ہے! آپ نے، جس شرافت سے میری اور اپنی محبت کو نباہا ہے، اس کی قدر نہ کرنا، عشق و وفا کا نام رسوا کرنا ہے لیکن واقعات، خواہشات کے پابند نہیں ہوتے، اور جو کچھ میرا اور آپ کا جی چاہتا تھا، اور جو کچھ میرے اور آپ کے معاملے میں واقعات پیش آئے، ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں بیاہی جا چکی، خیر سے بچے والی بھی ہوں، اللہ اسے زندہ رکھے میرا بیٹا چار برس کا ہو چکا ہے۔ بیحیائی ضرور ہے، مگر اظہار واقعہ اس موقع پر غالباً واجب و لازم ہے، اس لیئے عرض کرتی ہوں کہ میرے بہار کے دن ختم ہو چکے۔ میری آنکھوں کا رس، میرے ہاتھ پاؤں کا کس بل زائل ہو چکا ہے۔ میں نہ اب نوجوان ہوں، نہ بن بیاہی

اور آپ ابھی تک گذشتہ ایام کی تصویریں کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں! آپ کی صابرہ، سات آٹھ برس قبل والی صابرہ، اس دنیا میں نہیں ہے! پھر اس کی یاد کیسی؟ اور اس یاد پر دنیا کا تج دینا کیسا؟ کیا آپ کی اس محبت، آپ کی اس وفا کے بعد بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ میں آپ کو آرام سے دیکھوں؟ آپ کہیں گے "میرے لئے گزرے ہوئے دنوں کی تصویریں بہت ہیں!" میں عرض کرونگی تصویروں میں وہ گرمی نہیں جو عورت کے دل میں ہے، وہ خدمت کی صلاحیت نہیں جو عورت کے نازک ہاتھوں میں ہے اور وہ تسکین دہی کی طاقت نہیں جو زندہ عورت کے سینے میں ہے! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں!

میں اس لئے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دلاتی ہوں اور آپ کو اپنے ہی سر کی قسم دیتی ہوں کہ اب بن بیاہے رہنے کے خیال کو دل سے نکال ڈالئے اور اپنا گھر بسائیے! زندگی کی گاڑی بغیر دونوں پہیوں کے نہیں چلتی۔ آپ دنیا میں رہ کے سنیاس لئے بیٹھے ہیں اور وہ بھی مجھ نصیب جلی کے لئے! وفا ہو چکی، محبت کے امتحان کی حدیں کب کی گذر گئیں، اب تو صریحی خودکشی اور قطع نسل ہے! اگر مجھے آپ کی قدر نہ ہوتی، اگر میں آپ کے استقلال اور آپ کی پامردی کی قائل نہ ہوتی، یا میں آپ ہی کی صابرہ نہ ہوتی تو میں اپنی جگہ پر اس سے خوش ہوتی کہ آپ نے اپنی زندگی میرے پیچھے تباہ کر دی! لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے آپ کی اس موجودہ زندگی کا جب خیال آتا ہے تو میں کانپ اٹھتی ہوں میری سی حقیر و ذلیل عورت کے لئے آپ سا مرد اور جوگ لے! یہ میرے اوپر اتنا بار ہے جو میرے کمزور کاندھوں سے اٹھایا نہیں جا سکتا! اللہ اپنے پر اور مجھ پر رحم کیجیے اور اپنا گھر بسائیے!

آپ اگر یوں نہ مانیں گے تو میں خود کوئی لڑکی تلاش کر کے آپ کے متعلق سلسلہ جنبانی شروع کر دوں گی، پھر تو آپ اپنی صابرہ کو جھوٹی نہیں بنا سکتے! ...... میں آپ کے جواب کا بےچینی سے انتظار کرتی رہوں گی!"

اس خط کے پڑھنے کے بعد جو میری حالت ہوئی اس کا اندازہ انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو صاحبانِ دل ہیں۔ ایک طرف تو میرے دل میں صابرہ کے اس نئے ایثار اور اپنی یاد کی قربانی کی ترغیب پر مر مٹنے والا پیار آتا۔ دوسری جانب عقلِ سلیم یہ کہتی کہ صابرہ کی رائے درست و صحیح ہے! پھر عقل کی خشک ہیز می رائے میں اعصابی ہیجان ہاں میں ہاں ملا کر نرمی اور گرمی شامل کر دیتا۔ مرد۔ ایسا مرد جس کے قوائے عقلی و ذہنی درست ہوں، جس کی تندرستی ٹھیک ہو، اور جس کو کوئی جسمانی بیماری نہ ہو، تاہل کی زندگی کے لئے فطرتاً مجبور ہے۔ یہی فطرت میری عقل کے ساتھ تھی۔ دل کہتا صابرہ کی سی شریف، غیور اور باحیا خاتون کی یاد مجھ میں اب تک بسی رہی ہیں اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں چاہتا، اس گھر میں کسی دوسرے کو جگہ نہیں مل سکتی۔ جسم کہتا میں ایک خیال اور ایک تصویر کے لئے اپنے کو کب تک مارتا ہوں؟ پھر یہ امر تو عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی"۔ اس بحث میں بوالہوسی بھی آ کر شریک ہو جاتی اور اپنے مقصدِ خاص کے حصول کے لئے اور "شیوۂ اہلِ نظر" کی شکست کی غرض سے یہ بہانہ پیش کرتی کہ صابرہ تو خود ہی اس پر مصر ہے کہ برہمچاریہ کا بھرم ٹوٹے اور وہ بھی کن الفاظ میں! خدا و رسول کا واسطہ! اپنے سرِ عزیز کی قسم!

غرض رات دن میرا سینہ دیوانی کچہری تھا، جہاں دو مختلف الخیال وکیلوں کی جرح اور بحث بڑی گہما گہمی سے جاری رہی اور میں ایک جج کی طرح سب کچھ سننے کے لئے مجبور تھا!

میں نے چوتھے دن، اس خانگی جنگ سے عاجز آ کر صابرہ کے خط کے جواب میں لکھ بھیجا:۔

"نہ فراموش ہونے والی صابرہ! تمہارا خط ملا، میں تمہیں اس کے جواب میں کیا لکھوں؟

زہر دے اس پر یہ تاکید کہ پینا ہو گا! میں تمہارا صید، تمہارا گرفتار، تمہارا غلام! تم مجھے اپنا بنا
کے رکھو، کسی دوسرے کو تحفتہً دے دو، یا ہمیشہ کے لئے گلا گھونٹ دو۔ تم مالک و مختار ہو۔
نہ اپنے قبضہ قدرت میں ہوں، نہ مجھ میں فیصلہ کرنے کی اور نہ عزم و ارادہ کی صلاحیت ہے!
بس اتنا جانتا ہوں کہ قفس یا قید خانے کے بدلنے سے میں نہیں بدل سکتا! میں تمہارا ہوں
اور تمہارا ہی رہوں گا!"

دوسرے ہی دن جواب آیا۔

"بہت خوب، میں اپنے ہی اختیار تمیزی سے کام لوں گی اور آپ کا گھر بسا کے
دم لوں گی۔ اب آپ کو اپیل کا اختیار نہیں!"

اس کے بعد ایک ہفتہ تک کوئی خط نہیں آیا۔ پھر ایک پرزہ ملا۔

"نواب . . . . کی صاحبزادی میری دیکھی بھالی ہیں، حسین، سلیقہ شعار، پڑھی
لکھی اور نیک چلن۔ میں نے ان سے بات طے کر دی ہے۔ شاید اُدھر کے لوگ آپ
سے کسی دن ملنے آئیں۔ خدا کے لئے کوئی ایسی بات نہ کہہ دیجئے گا کہ ان لوگوں کو ناگوار
ہو اور میری سبکی ہو!"

بہر حال وہ حضرات آئے، گفتگو ہوئی اور پسند کا اظہار ڈھکے پردوں فرما کر میرا فوٹو لے
گئے۔ میں نے اپنے ایک دوست جاوید صاحب کو تاریخ و ساعت کا دن اور وقت کا تقرر
اور تمام انتظامات کا اہتمام سپرد کیا اور خود ایک کمیشن کے سلسلے میں دو ہفتے کیلئے کلکتہ چلا گیا۔

کلکتہ کی سیر و تفریح میں بہت کچھ دل بہل گیا تھا اور ہونے والی شادی کا خیال وہاں
کے مختلف اسٹوڈیوں کے دیکھنے کے سلسلے میں ذہن میں دھندلا سا رہ گیا تھا کہ دفعتہً میاں جاوید
کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ "عقد کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے اور اب اسے صرف بیس دن باقی رہ
گئے ہیں۔ اس لئے تمہیں جلد سے جلد واپس آنا چاہیئے۔ نیز اپنے ہمراہ وہ تمام چیزیں لیتے آنا جو

فہرست منسلکہ میں درج ہیں۔"

جی تو چاہتا تھا کہ میں اس مہمل خط کو "ورق بے معنی" کہہ کر دریائے گنگ میں غرق کر دوں، لیکن صابرہ سے زبان ہار چکا تھا اور بوالہوسی اور جسمانی لذات کی خواہش مارِ آستین بنی موجود تھی۔ اُس نے پھر سبز باغ دکھانا شروع کیا اور میں جاوید کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔

تین چار دن بعد جب میں ایک اچھی خاصی دوکان کھولنے کا سامان ساتھ لے کر لکھنؤ واپس آیا، تو جاوید اسٹیشن پر موجود ملے ساتھوں نے مجھے بتایا کہ شادی کی تاریخ محض اس لئے بڑھا دینا پڑی کہ لڑکی والوں میں سے کسی عزیز قریب کا دفعتہً انتقال ہو گیا اور اب جب تک کہ ان کی برسی نہ ہو جائے شادی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور گھر پہنچ کر میاں جاوید تو اپنی فرمائشات کی فہرست سے خرید شدہ تحائف ملاتے رہے اور میں، اس تھکے ہوئے مزدور کی طرح جو بارِ گراں منزلِ مقصود تک پہنچانے کے بعد سبکدوش ہو جاتا ہے، پڑ کے سو رہا۔ قریب شام جب میں سو کے اُٹھا تو جاوید گھر جا چکے تھے۔ منشی جی بھی نہیں آئے تھے اس لئے میں دیر تک حمام میں بیٹھا نہایا کیا۔

اس دیر کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے نہانے میں خاص لطف آ رہا تھا، بلکہ حمام میں پہنچتے ہی مجھے اپنا وہ نہانا یاد آ گیا جو مجھے عشق کی ابتدائی منزلوں میں بارہ بنکی کے سفر کے بعد پیش آیا تھا۔ اور پھر آٹھ برس پہلے والی صورت دماغ نے نظروں کے سامنے پیش کر دی اور پھر وہی ربودگی، وہی بدحواسی پیدا ہو چلی تھی کہ یہ خیال آیا کہ ہونے والی سُسرال ہیں موت،

صابرہ کو خط لکھنے کی نوید لے کر آئی ہے میں نے اس آٹھ برس کے عرصے میں نہ تو صابرہ کے میاں سے ملنے کی کوشش کی تھی اور نہ خود کبھی خط لکھنے میں سبقت کی تھی، لیکن آج بہانہ ہاتھ آگیا تھا، اس حادثے کے متعلق مزید تفصیلات جاننے کی کوشش نہ کرنا خلافِ انسانیت و مروت ہوتا۔ اس لئے میں نے جلدی جلدی جسم خشک کر کے کپڑے پہنے اور صابرہ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ پورا خط مجھے یاد نہیں، لیکن بعض حصے اب بھی حافظے میں محفوظ ہیں۔ میں نے کلکتہ سے واپسی کی خبر دینے اور اس کی خوشی کے لئے اپنے کو شادی کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دینے کا تازہ وعدہ کرنے کے بعد اس حادثے کی نوعیت کے متعلق اطلاع چاہی تھی اور پھر ایک بار لجاجت سے لکھا تھا:۔

"صبر آزما صابرہ! یہ یاد رکھو کہ یہ رشتہ میں نے تمہارے حکم سے منظور کیا ہے لیکن یہ میری محبت کا تم سخت ترین امتحان لے رہی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ ع
"بت سامنے رکھ لینا اور یاد خدا کرنا!"
مگر دیوی یہ مجھے اس کے لئے بنائے جاتے ہیں جو جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ نہ کہ اس کی عوض جو حسن مجسم ہو! تمہارے پرستار کے لئے پتھر کی دیوی میں دل پھونکنے والی گرمی کہاں؟ تم کہو گی وہ پتھر کی نہیں انسان ہے، جوان ہے! مجھے یہ تسلیم ہے، پہلو ضرور گرم ہوگا، میں کوئی راہب نہیں! لیکن ...... لیکن میری صابرہ، سمجھنے کی کوشش کرو، کیا تم تاہل کی زندگی میں مجھے بھول سکیں؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے جواب دو۔ کیا کسی خیالی تصویر کو دل سے لگائے بیٹھے رہنا اس حالت میں بھی اتنا ہی آسان ہے؟ تم کہو گی میں عورت ذات ہو کہ یہ مراحل جھیل رہی ہوں، تم مرد ہو کر اس مصیبت سے کیوں ڈرتے ہو؟ میں کہوں گا کہ یہ تو مقتضائے دوستی نہیں کہ کہا جائے کہ "ہم تو ڈوبے ہیں مگر یار کو لے ڈوبیں گے۔" تم ایک شریف، بے بس خاتون تھیں اور میں ایک آزاد و خود مختار مرد ہوں، تمہیں زبردستی بیڑیاں پہنائی گئیں۔ تم چاہتی ہو میں خوشی خوشی

خود سے پہن لوں۔ للہ اب سے اپنے بندہ پر رحم کر۔ جب سے میں نے اس حادثے کی خبر سنی ہے۔ "فرصت کے رات دن" کے شیریں خواب پھر دیکھنے لگا ہوں۔ کاش یہ خواب تمہارے ہاتھوں شرمندۂ تعبیر نہ بنتا۔۔۔۔۔۔۔"

غرض مختلف پیرایوں میں بہت سی خوشامد اور لجاجت لکھ کر لفافہ بند کیا، مہر لگائی اور اپنے سب سے معتمد آدمی کو بلا کر حوالہ کیا، نواب صاحب کی حویلی کا پتہ بتایا اور تاکید کر دی کہ سوائے رسولن ماما کے جو میرے اور صابرہ کے خطوط لایا اور لے جایا کرتی تھی کسی دوسرے کو خط نہ دے۔

کوئی دو گھنٹہ بعد صابرہ کا جواب آیا۔ میرے ہی خط پر لکھا تھا۔

"رشید صاحب۔ آپ کی شادی مجھ ہی مانگ اُجڑی کی وجہ سے رُک گئی، آج پانچواں دن ہے کہ میرا بچہ یتیم ہو گیا"۔

اس خبر کا مجھ پر جو اثر ہوا اس کا تجزیہ مشکل ہے۔ میں کبھی روتا تھا اور کبھی ہنستا تھا۔ روتا اس لئے تھا کہ صابرہ نے میرا گھر بسانے کی کوشش کی اور اس کا گھر خود اُجڑ گیا۔ ایک رنجور و مہجور انسان میں اپنے کو خاص طور سے قسمت کا ستایا سمجھ لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے وہ یہ بہت آسانی سے یقین کر لیتا ہے کہ اس کے دوست احباب پر بھی جو مصائب آتے ہیں، ان سب کا باعث وہی ہے۔ میں نے اپنے کو بہت دنوں سے قسمت کا ستایا سمجھ رکھا تھا، اسلئے صابرہ کے اس نئے غم کا سبب بھی اپنے ہی کو مان لینا بہت ہی معمولی سی بات تھی، میں ان مصائب و تکالیف سے اچھی طرح واقف تھا جو ایک ہندوستانی بیوہ کو آئے دن برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ میں اس کو خوب جانتا تھا کہ ہمارے اس ملک میں بیوہ کے معنی بعض موقعوں پر بالکل اچھوت کے ہیں۔ یہی نہیں کہ اس کا سہاگ چھن جاتا ہے اور وہ دنیاوی جنگ کے لئے

بالکل یکہ وتنہا رہ جاتی ہے، بلکہ اس کے لئے اس طرح کے آلام ومصائب فراہم کردیئے جاتے ہیں جو دیگر ممالک کے باشندوں کے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتے، دولھا کا ہر عزیز اسے بھُن پیری، منحوس اور رفائلہ سمجھنے لگتا ہے اور اپنی اپنی ذہنیت اور صلاحیت کے مطابق اس کیلئے سزائیں تجویز کرتا ہے۔ صابرہ واقعی اسم بامسمیٰ تھی۔ اس کا تحمل، اس کی بردباری، اسکا استقلال بے عدیل ونظیر تھا، لیکن پھر بھی میاں کا سہارا اُٹھ جانے اور ایک باعصمت پردہ دار خاتون ہونے کی وجہ سے اس پر کوہ الم ٹوٹ پڑا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کس طرح اس کے پاس پہنچ کے اسے تسکین دوں، اس لئے اپنی اور اس کی بے بسی پر دل کڑھتا اور آنسو اُمڈے آتے تھے۔

ساتھ ہی ہنسی بھی آتی تھی اور وہ اس بات پر کہ بی صابرہ خوشیاں منانے اور مجھے دولھا بنانے چلی تھیں۔ گویا اس صنفی لطافت ونزاکت کے باوجود آپ نے میرے لئے قسام ازل اور کاتب تقدیر سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا! ایک پریچہرہ کے دستِ سیمیں اور مقدر کا فولادی پنجہ! پھر اس خیال پر بھی ہنسی آتی تھی کہ جہاں تک اس ہونے والے رشتہ کا تعلق تھا مجھے اس کے ٹل جانے سے خوشی تھی، مگر اُدھر دوسری جانب، خدا جانے کیا کیا چہ میگوئیاں ہونگی اور بہت ممکن ہے کہ وہ ناکردہ کار، جو میرے سر منڈھی جانے والی تھی، اپنے دل میں گھٹتی اور کُڑھتی ہو۔ ادھر اس مخمصے سے چھوٹنے پر اطمینان وامتنان کے جذبات، اُدھر اس نئی رکاوٹ کے باعث ایک مستِ شباب حسینہ کے چہرے پر غم کے آثار!

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے دل میں سوائے ان جذبات کے اسوقت تک کوئی

اور خیال نہ آیا تھا۔ لیکن شام کو جب جاوید آئے اور اُن سے گفتگو ہونے لگی تو انہوں نے ایک ایسا فقرہ کہدیا کہ جس سے میرے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا۔ جاوید میری اور صابرہ کی حالت پر افسوس کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ دیر چپ رہے۔ پھر یکبارگی مسکرا کر بول اُٹھے۔" ارے یار رشید تم بھی عجیب سودائی ہو۔ اب تو میدان صاف ہے، صابرہ بیگم تو اب تمہاری ہیں!"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جاوید نے میرے قلب پر اچانک خنجر کا وار کر دیا ہو۔ میری اور صابرہ کی محبت ایسی نہ تھی کہ میں اس کی مصیبت کے وقت ان لغویات پر غور کر سکتا۔ میں نے اسی لئے جاوید کو بہت ہی تیکھے تیوروں سے دیکھ کر کہا۔" جب تمہیں شریفوں کے احساسات و جذبات کا علم نہیں ہے تو تم خاموش ہی رہنے کی کوشش کیوں نہیں کیا کرتے؟ جو مہمل بات منہ میں آئی کہہ گزرے!"

وہ کچھ شرمندہ و منفعل ہو کر اپنی صفائی میں بحث کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔" بہتر ہے کہ آپ اس وقت خاموش ہی رہیں، ورنہ ممکن ہے کہ آپ پھر کوئی ایسی بے تکی بات کہہ دیں کہ میرے لئے اور بھی باعثِ آزار و تکلیف ہو۔"

انہوں نے آزردہ ہو کر مجھے دیکھا اور اُٹھ کر گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر تو میں ان کو چپکے چپکے خوب برا بھلا کہا کیا۔ پھر بد طینتی اور خود غرضی نے آہستہ آہستہ ان کی وکالت شروع کی۔ میں نے گھبرا کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اب میں لاکھ لمبے لمبے ڈگ لگاتا اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا ہوں مگر دماغ میں وہی ایک فقرہ گونج رہا ہے۔" اب میدان صاف ہے، صابرہ بیگم اب

تو تمہاری ہیں!"

شریف جذبات کہتے کہ اس طرح کا خیال بھی اسوقت دل میں لانا کمینہ پن ہے، وہ تو میاں کے سوگ میں بیٹھی ہے، اسے، تو اپنی خوشیوں کے پامال ہونے کا رنج ہے اور اپنے بچے کی یتیمی کی اذیت اور تمھیں اپنی خود غرضی سے، ظاہر بظاہر نہ سہی، مگر خفیہ طور پر مسرت ہے، نہ تو اس کی تکلیف کا خیال اور نہ اس کا دھیان کہ تم اسے کس طرح تسکین دے سکتے ہو، بس اپنے صوبے مانڈے کی فکر!

رذیل جذبات کہتے آٹھ برس تک بیٹھے رہے، زندگی برباد کی، اب جب اُمید کی جھلک دکھائی دی تو خوش نہ ہونا اپنے کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اب اس ستارۂ اُمید کو بھی زبردستی اگنی بیتال سمجھ کر اس سے گریز کرنا شرافت و غیرت نہیں، بلکہ خودکشی ہے اور نفس کا صریحی خون ہے۔ یہی کرنا تھا تو دنیاوی زندگی اور جہد للبقا میں حصّہ ہی کیوں لیا۔ راہب بن گئے ہوتے اپنی شخصیت ہی مٹا ڈالی ہوتی، اپنے کو اس طرح فنا کر دیا ہوتا کہ بجائے رشید کے "صابرہ" ہو گئے ہوتے!"

یہ طعن و تشنیع، وار اور رد، حملہ اور دفاع، میرے سینے کے اندر برابر جاری رہے میں نے بڑی مشکلوں سے اس جنگِ زرگری کو بند کیا اور صابرہ کو حسبِ ذیل تعزیت کا خط لکھا:-

"میں تمھیں کس منہ سے تسکین دوں۔ نہ میں تمھارے گرد و پیش کے لوگوں سے واقف اور نہ ان واقعات کا مجھے علم جو تمھیں اس وقت پیش آ رہے ہونگے۔ بے بس ہوں ورنہ تم تک کسی طرح پہنچتا اور اپنا خون بہاتا، مگر تمھاری نرگسی آنکھوں سے آنسو نہ نکلنے دیتا لیکن اگر کسی قسم کا کام ہو تو خدارا اپنے غلام کو نہ بھولنا۔ اسوقت یہ نہ سوچو کہ میں کیا ہوں، کون

ہوں بس اتنی سی بات یاد رکھو کہ خداوندِ عالم نے تمہاری خدمت کے لئے ایک مشین نما
انسان بنا دیا ہے جو تمہاری خوشی کے سامنے دنیا میں کسی امر کی پرواہ نہیں کرتا۔
خدا ہی تمہیں صبر دے۔ یہ غم عورت کے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ خدا
تمہارے بچے کو اپنی حفاظت و امانت میں رکھے، وہ ابھی اس نعمت کی قدر کیا جانے جو اس
سے چھین لی گئی ہے۔ تمہیں کو اب باپ اور ماں دونوں کے فرائض ادا کرنے ہیں۔۔
میں تمہارے احکام کا ہر وقت منتظر رہوں گا۔"

صابرہ نے اس خط کا تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن دسواں بیسواں چہلم وغیرہ جو نواب
صاحب مرحوم کے لئے کیا گیا ان سب کی مجھے باقاعدہ اطلاع دی گئی اور میں ہر ایک رسم
میں برابر شریک ہوا۔ اس آمدورفت میں وہاں کے آدمیوں اور داروغہ وغیرہ سے ملاقات
ہوگئی۔ اور مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ نواب صاحب کا پانچسو کا وثیقہ تھا اور شہر میں
چند مکانات بھی تھے، جن سے خاصا کرایہ آتا تھا۔ جس مکان میں صابرہ مقیم تھی، وہ پرانے
محلوں کی شان کا تھا، مردانہ اور زنانہ حصّہ علیحدہ علیحدہ، کافی وسیع اور کشادہ تھا۔ لیکن
چونکہ نواب صاحب کے بڑے بھائی اب تک حیات تھے، اس لئے یہ مکان دو حصّوں میں
منقسم تھا۔ ایک میں اُن کے عیال رہتے تھے اور دوسرے میں صابرہ بیگم اور اُن کا بچہ۔
چہلم کے بعد عدہ کی مدت تک صابرہ کی والدہ بیٹی کے ساتھ مقیم رہیں، لیکن جیسے
ہی یہ مدت ختم ہوئی اسے اپنے ہمراہ لیکر اپنے گھر چلی آئیں۔ یہاں آنے پر صابرہ نے رسولن
کے ذریعہ میرے پاس کہلا یا کہ مجھے اس کے چچا سے مل کر تمام واقعات معلوم کرلینا چاہیئے
اور وثیقہ و مکان کا داخل خارج بچے کے نام کرا دینا چاہیئے۔ نیز اس کی ولایت کے متعلق

ساری قانونی کارروائی کرڈالنا چاہیئے میں نے صابرہ کے میکے میں آنا جانا شروع کیا۔ دو ایک بار تو صابرہ کے چچا "بڑے صاحب" کا درمیان رہا پھر براہ راست صابرہ کے ہاں تمام قضیہ میں نے کہلانا شروع کیا۔ ادھر صابرہ کی سسرال والوں نے طرح طرح کے اُلجھاوے ڈالنا شروع کیئے، بالآخر مقدمہ بازی تک نوبت آئی۔ میں بحمدہ اس امر میں کامیاب رہا، میں نے نواب صاحب کا وثیقہ اور تمام املاک صابرہ کے بچے کے لیئے بچالی اور صابرہ کو باقاعدہ اس کی ولیہ عدالت سے تسلیم کرالیا۔

ان تمام معاملات کے سلجھانے میں تقریبًا ایک سال کا عرصہ لگا۔ میری ہونے والی سسرال والے چونکہ صابرہ کے فریق مخالف کے ہمدردوں میں تھے، اس لئے مجھے ان کے ہاں رشتہ سے انکار کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ اس کی اپیل اگر ہوسکتی تھی تو صابرہ ہی کے ہاں، لیکن اب وہاں تک ان لوگوں کی رسائی نہ تھی۔

ہمارے نجی معاملات اتنے ترقی پذیر ہو گئے تھے، کہ زنانے اور مردانے حِصّے میں جو ٹیلیفون تھا، مجھے اس پر حاضر ہو کر ہر ہفتے مقدمات کے سلسلے میں، صابرہ سے گفتگو کرنا پڑتی تھی۔ جس دن تک صاحب جج کی عدالت سے مقدمات کا آخری اور قطعی فیصلہ نہیں ہو گیا، میں نے کوئی بات سوائے قانون، گواہ اور مقدمے کے نہیں کی۔ میں ایک وکیل تھا اور صابرہ موکلہ۔ لیکن .... جب میں نے صاحب جج کی زبان سے فیصلہ اپنے موافق سُنا، تو میں کچہری کے سارے کام چھوڑ کر سیدھا صابرہ کے مکان پہنچا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی اور صابرہ کے "ہلو" کہنے پر مبارکباد دی۔ وہ اپنے بچے کے حقوق کے محفوظ

ہو جانے سے اس قدر خوش ہوئی کہ رونے لگی اور بھرائی ہوئی آواز میں رُک رُک کے بولی۔

"رشید صاحب آپ نے مجھ پر اور میرے بچے پر وہ احسانات کئے ہیں کہ ان کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "صابرہ غلاموں کا شکریہ ادا نہیں کیا کرتے۔"

وہ بے ساختہ بول اُٹھی "وکیل صاحب میں تو خود کو آپ کی کنیز سمجھتی ہوں، آپ میرے محسن ہیں، میرے بچے کے محسن ہیں۔ اللہ اب غلام کا لفظ کبھی اپنے نام کے ساتھ نہ استعمال کیجئے گا۔ مجھے حد درجہ تکلیف ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "بہت خوب، لیکن پھر تم بھی کبھی شکریہ کا لفظ میرے بارے میں نہ نکالنا۔ اس سے بُوئے غیریت آتی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ میرا قانون پڑھنا اب جا کے سوارت ہوا۔"

صابرہ نے کہا "یہ آپ کی نیکی و شرافت ہے۔"

میں نے کہا "جی نہیں یہ میری خود غرضی و نفسانیت ہے۔"

صابرہ کے لب و لہجہ سے استعجاب کا پتہ چلتا تھا۔ اس نے پوچھا "یہ کیونکر؟"

میں نے کہا "خود غرضی کا یہی تو تقاضا ہوتا ہے کہ جو کام کیا جائے وہ اس غرض سے کہ اس سے اپنی مصیبتیں گھٹیں، اپنی فکریں کم ہوں، اپنا درد دل زائل ہو، اپنے کو خوشی حاصل ہو اور اپنے قلب کو اطمینان و سکون حاصل ہو۔ میں نے بھی یہی کیا ہے اور صرف یہی! جس کام سے تمہاری تکلیفوں میں کمی ہو سکے، جس سے تمہارے آلام دور ہوں، جس

سے تمہاری راحت میں اضافہ ہو، وہ میرے لئے سب سے زیادہ موجب انبساط و مسرت ہے،
اس لئے میں نے جو کچھ اس معاملے میں کیا وہ محض اپنی ہی تکلیفوں کے کم کرنے کے لئے
اور اپنی ہی مسرتوں میں اضافہ کی غرض سے۔ یہ اگر خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے؟ اسمیں
کسی پر احسان کیسا اور مفت مفت کے شکریہ کی کہاں گنجائش؟"

صابرہ دیر تک خاموش رہی۔ پھر رُک رُک کے بولی "تو پھر . . . . . اتنی محبت
. . . . . . اتنے ایثار کا . . . . . کچھ تو عوض میری طرف سے بھی ہونا چاہیئے!"

میں نے کہا "اگر معاوضہ ہی لینا ہے تو پھر منہ مانگا ہی لوں گا"

صابرہ نے کچھ گھبرا کے کچھ ڈر کے پوچھا "وہ کیا ہے؟"

میں نے بہت ہی بیتابی سے کہا "کیا آج آٹھ برس کی پرستش کے بعد بھی پوچھنے کی
ضرورت ہے؟ تم اور صرف تم!"

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر صابرہ آہستہ آہستہ بولی "اگر آپ کی جگہ کسی دوسرے نے
یہ بات کہی ہوتی تو شاید میں اس سے زندگی بھر کے لئے خفا ہو جاتی"۔

میں نے عرض کیا "آخر اس خفگی کا نتیجہ کیا ہوتا؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ اس سے زندگی
بھر نہ ملتیں، اپنے حضور میں آنے کی اجازت نہ دیتیں۔ تو غلام بادب عرض کریگا خوشنودی
کی حالت میں بھی تو اس پر یہ عتاب ہے، آخر خفگی و خوشی میں کیا فرق ہے؟"

پھر تھوڑی دیر سکوت رہا۔ اس کے بعد جواب ملا "اور یہ جو آپ سے باتیں کر رہی
ہوں اور . . . . ."

جب وہ کہتے کہتے رُک گئی تو میں نے جواب دیا "میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن شاید اتنا تو ہر موکلہ کو اپنے وکیل سے کرنا ہی پڑتا ......"

صابرہ نے پوچھا "اسی خلوص سے ؟"

میں نے کہا "جی ہاں، ورنہ خلوص سے کام بھی نہ ہوتا !"

صابرہ خاموش ہوگئی۔ میں نے کہا "صابرہ مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے کا نتیجہ ! تم جانتی ہو کہ مجھے دنیا میں صرف ایک چیز کی خواہش ہے اور وہ تمہاری ذات ہے۔ مجھے نہ دولت کی ضرورت ہے، نہ عزت کی، نہ وجاہت کی، میرے لئے ساری کائنات سمٹ کر صرف ایک ذات میں محدود ہوگئی ہے۔ مجھے اگر وہ ذات نہ ملی تو میرے لئے زندگی ایک مستقل عذاب ہے۔ اور اس کے بعد کی زندگی کے لئے نہ مجھے جہنم کا ڈر اور نہ جنت کی پروا ! ..."

صابرہ نے بات کاٹ کر کہا "رشید صاحب میں نے مانا آپ کو میری وجہ سے بڑی اذیتیں ہوئیں مگر اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ دین و ایمان سب بھول کر جہنم و جنت سب سے انکار کر کے کفر بکنے لگیں !"

میں نے غصہ میں کہا "بیگم صاحبہ میں نے خدا و رسول والی ہی بات کہی تھی جو آپ اس قدر برہم ہوگئیں کہ زندگی بھر کے لئے ناخوش ہونے کو تیار تھیں۔ کیا خدا نے بیوہ سے عقد کا حکم نہیں دیا ؟ کیا رسول اللہ نے خود اس پر عمل کر کے نہیں دکھا دیا ہے ؟ لیکن آپ نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ سوائے ہندوستان کے کسی ملک میں اسے نہ معیوب سمجھتے ہیں اور نہ خلاف عقل و شرع ......"

صابرہ نے پھر بات کاٹ کے پوچھا:" اور ہم لوگ اس وقت ہیں کہاں؟ ہندوستان میں یا کسی اور ملک میں؟"

میں نے کہا:" جی ہاں ہندوستان ہی میں ہیں۔ لیکن اب ہندوستان کے باشندے بھی نہ اسے معیوب سمجھتے ہیں اور نہ قابلِ مضحکہ۔ ہندوؤں نے یہ مذموم خیال اپنے دل سے نکال ڈالا۔ اب ان کے ہاں قابلِ شادی بیوائیں بٹھائی نہیں جاتیں اور نہ ان کے سر مونڈے جاتے ہیں!"

صابرہ نے کہا:" لیکن قابلِ شادی نا؟ یہاں قابلِ شادی کون ہے؟ جس کا کافی سن آچکا ہو، ایک بچہ کی ماں ہو چکی ہو اور اپنے میں بڑھاپے کے تمام آثار پاتی ہو، وہ قابلِ شادی کیونکر ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا:" صابرہ خدا کے لئے ہارے ہوئے حریف کی طرح جھوٹ بولنے پر نہ اُتر آؤ۔ تم اپنے سن و سال کے متعلق اُس شخص سے گفتگو کر رہی ہو جو ایک سال سے تمہارا وکیل ہے اور آٹھ برس سے . . . . تمہارا عاشق ہے۔ کیا مجھے اتنا بھی حساب نہیں آتا کہ میں پندرہ میں آٹھ جوڑ لوں اور اپنی عمر میں بھی اتنے ہی برسوں کا اضافہ کر لوں؟ اگر تم تیئس برس کی ہوئیں تو میں بھی تیس برس کا، پھر شادی سے اور سن سے کیا تعلق؟ میری اور تمہاری محبت بھی بوالہوسی اور حیوانیت پر مبنی ہے کہ ہمارے عقد میں بھی جسمانی حیثیات و کیفیات کا لحاظ کیا جائے؟ صابرہ بیگم یہ جسم کی نہیں روح کی پیاس ہے! اسے سوائے تمہارے سارے عالم کے دریاؤں کا پانی، یہاں تک کہ کوثر و تسنیم کا آبِ شیریں بھی نہیں بجھا سکتا!"

صابرہ نے کہا" لیکن وہ چشمہ جس سے آپ سیراب ہونا چاہتے ہیں اب خشک ہو گیا!"

میں نے خوف زدہ آواز میں دریافت کیا" کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں رہی؟"

صابرہ نے کہا" میں نے شاید مثال دینے میں غلطی کی چشمہ خشک نہیں ہوا ہے۔ بلکہ وہ اس قدر گندہ کر دیا گیا ہے کہ وہ اب آپ کی پیاس بجھانے کے قابل نہیں رہا"

میں نے پوچھا" یعنی؟"

وہ بولی" یعنی یہ کہ میری محبت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی اور کی بیوی بننے کے بعد آپ کی بنوں"

میں نے پوچھا" یہ محبت کس کی جس کی بیوی تھیں یا میری؟

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی" آپ کی!"

میں نے کہا" یہ اظہار محبت کا بالکل ہی انوکھا طریقہ ہے کہ چونکہ تمہیں مجھ سے محبت ہے، اس لئے میں ہمیشہ کے لئے محروم بنا دیا جاؤں"

صابرہ نے کہا" جی نہیں یہ آپ کو ایک طرح کی خودکشی سے بچانا ہے!......"

صابرہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ایک معظمہ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً ادھر متوجہ ہوئی اس لئے کہ کسی نے پوچھا" کون ہے بیٹا۔ وکیل صاحب؟"

صابرہ نے کہا" جی ہاں" انھوں نے کہا" میری طرف سے ان کو دعا کہو"

میں ٹیلیفون سے سن رہا تھا میں نے صابرہ کو پیغام کی زحمت سے بچایا اور خود اس سے

تسلیم کرنے کو کہا اور مقدمہ جیتنے کی مبارکباد دی۔ وہ خود ٹیلیفون لے کر دعائیں دے کے بولیں "خدا آپ کو بھی مبارک کرے یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ آپ نے میرے یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے محتاجی اور غریبی سے بچا لیا، خدا آپ کو اجر دے گا۔ ہم غریب دکھیاریوں کے پاس کیا ہے جو ہم اس کا بدلہ کر سکیں۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر صابرہ اور اس کا لڑکا شریف ہیں، تو دونوں یہ احسان کسی وقت نہ بھولیں گے اور جان و مال، عزت و آبرو کسی چیز سے آپ کے معاملے میں دریغ نہ کریں گے۔"

میں نے عرض کیا "یہ آپ کیا فرماتی ہیں، یہ تو میرا فرض تھا۔"

وہ بولیں "میاں یہ تمہاری شرافت ہے کہ تم ایسا کہتے ہو، مجھے تو جہاں تک معلوم ہے تمہیں شاید اب تک کوئی فیس بھی نہیں دی گئی ہے۔"

بظاہر معظمہ نے صابرہ سے اس کی تصدیق چاہی اس لئے کہ وہ کہتی ہوئی سنائی دی کہ "امی میں تو کہتے کہتے تھک گئی۔ اب آپ بھی ارشاد فرما کے دیکھ لیجئے۔"

معظمہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "کیوں میاں یہ کیا سنتی ہوں کہ تم فیس نہیں لینا چاہتے؟"

میں نے حجاب و شرم کو بالائے طاق رکھ کر موقع سے فائدہ اُٹھایا اور عرض کیا۔ "بیگم صاحبہ یہ کس نے کہا کہ میں فیس نہیں لینا چاہتا، میں تو حضور خود مانگ رہا ہوں۔"

وہ بولیں "صابرہ کہتی ہے میں فیس دینا چاہتی ہوں وہ نہیں لیتے۔"

میں نے عرض کیا۔ "جی ان کا بھی فرمانا ایک حد تک صحیح ہے اور جو کچھ میں نے عرض کیا وہ بھی صحیح ہے۔"

وہ بولیں "بھئی میں یہ پہیلی نہیں بوجھی۔ وہ بھی سچی آپ بھی سچے۔ وہ کہتی ہے آپ فیس نہیں لیتے، آپ کہتے ہیں میں مانگ رہا ہوں وہ نہیں دیتیں۔ آخر معمہ کیا ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا "بیگم صاحبہ آپ نے ابھی اپنی عزت افزائی اور بندہ نوازی سے یہ فرمایا تھا کہ تو نے وہ کام کیا ہے کہ صابرہ بیگم اور ان کے صاحبزادے کو چاہیئے کہ وہ تیرے لئے جان و مال عزت آبرو تک دریغ نہ کریں۔

وہ فرمانے لگیں "میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں تو شریف نہیں جس شخص نے ایک سال سے اپنا خون پانی ایک کر دیا ہو۔ اپنے پیشہ کا کام ان کے پیچھے خراب کر دیا ہو، دنیا بھر سے ان کے کارن دشمنی مول لی ہو، جس نے ویسی ہمدردی کی ہو جیسی سگا باپ اور حقیقی بھائی مشکل سے کرتا ہو، اس کا احسان بھول جانا کمینوں کا کام ہے شریفوں کا نہیں۔"

میں نے کہا "تو معظمہ اس طرح کے کام کی فیس تو صابرہ بیگم نہیں ادا کر سکتی ہیں حضور ہی عطا فرما سکتی ہیں۔"

وہ بہت ہی سادگی سے بولیں "تو میاں تم بتاؤ تو سہی۔ آخر کیا فیس ہوتی ہیں میں ہی ادا کر دونگی تم میرے ہاتھ سے لے لینا۔"

میں نے رکتے رکتے عرض کیا "تو حضور میں تو اپنی محنت کی فیس یہی سمجھتا ہوں کہ حضور مجھے اس کا حق عطا فرما دیں کہ میں تمام عمر اسی طرح آپ کی صاحبزادی اور آپ کے نواسے کی خدمتیں کرتا رہوں۔"

وہ بیچاری اس گھماؤ کی بات کو نہ سمجھیں۔ گھبرا کے بیٹی سے پوچھنے لگیں کہ "وکیل صاحب کیا فیس مانگتے ہیں۔ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

وہ بولیں "امی ٹیلیفون پر آپ سے انھوں نے کیا کہا میں اسے کیا جانوں آپ انھیں سے پوچھئے وہ خود ہی اپنا مطلب بتائیں گے۔"

جتنی دیر ماں بیٹی میں گفتگو ہوئی اتنی دیر میں میں نے جملہ ذہن میں ترتیب دے لیا تھا۔ اس لئے قبل اس کے کہ بیگم صاحبہ مجھ سے کچھ پوچھیں میں نے عرض کیا "جناب معظمہ نے میرا مطلب نہیں سمجھا میں یہ چاہتا ہوں کہ حضور اپنے اس غلام کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔"

بیگم صاحبہ میرا یہ فقرہ سنتے ہی ساکت ہو گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس سکوت کا باعث استعجاب تھا یا غصہ۔ البتہ میری حالت یہ تھی کہ پنکھے لگے تھے۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا دیکھئے اتنے دنوں کی اُمیدوں پر پانی پھر جاتا ہے، یا سوکھے دھانوں پانی پڑتا ہے ...... ساری عمر ..... کا اضطراب چند لمحوں میں آکے جمع ہو گیا تھا۔ تین بار پیشانی سے پسینہ پونچھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ شاید محشر کے دن قبل فیصلہ یہی کیفیت ہو گی! بارے مہر سکوت ٹوٹی۔ بیگم صاحبہ آہستہ آہستہ بولیں۔

"میاں تم نے اس وقت اچانک ایسی خواہش پیش کر دی جو خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی، میں بڑے سوچ میں پڑ گئی کہ تمھیں کیا جواب دوں۔"

میں نے جلدی سے عرض کیا "حضور میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھے اسی وقت جواب مل جائے حضور میری ذات، میرے خاندان کے متعلق دریافت فرمالیں۔ میرے چال چلن کی تحقیق کر لیں...."

وہ بولیں۔ نہیں میاں، تمہارے چال چلن، تمہاری شرافت اور نیکی سے کون واقف نہیں ہے۔ پھر پڑھے لکھے، دال روٹی سے خوش، اللہ رکھے تم ہی ہو، مجھے ان باتوں کی فکر نہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اب صابرہ کنواری، بن بیاہی نہیں ہے، بیوہ، بچے والی ہے، اب اس کی خواہش و رضامندی ضروری ہے۔ ذرا اس کا عندیہ لے لوں اور دوسرے اعزّہ سے پوچھ گچھ لوں......"

میں نے کہا" تو مجھے اس وقت اجازت دیجئے۔ پھر انشاء ضرورت ہوگی تو حاضر ہونگا"

انھوں نے فرمایا" اچھا خدا کو سونپا۔ سدھارو" میں نے تسلیم کی اور وہاں سے چلا آیا۔ رات کو رسولن ایک خط لیکر آئی۔ صابرہ نے لکھا تھا۔

" یہ آخر آپ کی عقل کو کیا ہوگیا ہے کہ دوستی اور دشمنی کی باتوں میں فرق نہیں سمجھا جاتا۔ اور اپنی دھن میں چھوٹے بڑے کی تمیز بھی کھو بیٹھے۔ امی سے بھلا اسطرح کی خواہش کا کیا موقع تھا؟ وہ میرا بھلا دیکھیں گی یا آپ کا؟ میں آپ سے منت کرتی ہوں کہ اب سے اپنے خیال سے باز آئیے۔ میں ڈھلتی ہوئی دھوپ ہوں جسمیں نہ آپ کو کوئی چمک دمک نظر آئے گی اور نہ کسی قسم کی گرمی محسوس ہوگی۔ میرے ہاں اچھی طرح خزاں آچکی ہے۔ آپ کے ابھی بہار کے دن ہیں۔ اپنی جوانی پر رحم کیجئے اور اس خیال بد کو دل سے نکال ڈالئے"

میں نے جواب میں لکھا۔

" مجھے ڈھلتی ہوئی دھوپ اور خزاں یافتہ بہار پسند ہے۔ خود میری محبت میں اتنی حدت ہے کہ وہ بردوت کا سارا مخزن جلاسکتی ہے۔ میرے دل کی آگ، نم کیا ہو، برف کی قاش میں بھی حرارت پیدا کرسکتی ہے۔ صابرہ بیگم صاحبہ! آپ میری ناصح و مشفق نہ بنیں بلکہ اس محبت کا مظاہرہ فرمائیں جس میں علیحدگی و جدائی کی جگہ اتحاد و اتصال کی خواہش کیجاتی ہے

میں صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر اب بھی انکار کیا گیا تو مجھے اس امر کا یقین آجائیگا کہ میں آج ہی نہیں بلکہ پورے آٹھ سال سے بیوقوف بنایا جارہا ہوں اور پژمردہ کلیوں کے تحفے نے جس اُمید کو ہر سال تازہ کیا تھا وہ محض موہوم تھی۔اس یقین کے بعد میرا کیا حال ہوگا اس کا علم خدا ہی کو ہے ابھی تک تو خیال تھا کہ" بریں زیستم وبریں بگزرم" لیکن جب یہ اُمید بھی جاتی رہے تو میری حالت اس عمارت کی ہوگی جس کا ستون اچانک گرا دیا جائے اور جس کی بنیاد کھود کر پھینک دی جائے۔ للّٰہ اب زیادہ دل نہ دکھایئے!

ع رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اس خط کا کوئی جواب نہ ملا لیکن تیسرے دن بیگم صاحبہ کی مہری ان کا خط لیکر آئی لکھا تھا:۔

"جس رشتے کی خواہش کی گئی تھی وہ مجھے اور تمام اعزا کو دل وجان سے پسند ہے مگر صابرہ نہ سرسے کھیلتی ہے اور نہ منہ سے بولتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔"

میں نے مہری سے کہا کہ" اچھا تم جاؤ میں جواب بھیجدوں گا اور صابرہ کو خط لکھا:۔

"بیگم صاحبہ کی رضامندی کا صحیفہ آگیا۔ لیکن آپ کے ہاں ابھی وہی ضد جاری ہے۔ خیر میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے۔ آج آپ کے سارے پچھلے خطوط اور ہرسال کی پژمردہ کلیاں اسی لفافہ میں ارسال ہیں یا تو آپ ان کے عوض ایک تازہ پھول بھیج کر میری استدعا قبول فرمائیں گی یا پھر اپنے سکوت سے اس امر کو واضح فرمادیں گی کہ میری زندگی کا سب سے بہتر وشیریں خواب منت کش تعبیر نہ ہوگا! میں ۲۴ گھنٹے انتظار کرنے کے بعد اس طرح روپوش ہوجاؤں گا کہ انشاء اللہ تمام عمر آپ کو پتہ بھی نہ مل سکے گا۔"

کچھ ہی دیر بعد جواب آیا: "آپ خفا نہ ہوں، پھول جاتا ہے، مگر باسی ہے!"

میں نے بڑی سرمستی و خوشی سے لکھا: "کچھ پروا نہیں۔ میں اسی پھول کو خونِ دل سے سینچ کر پھر تر و تازہ کر لوں گا!"

اسی دن بیگم صاحبہ کو بھی اطلاع ہو گئی۔ اور . . . . . . اور . . . . آج تک وہ پھول میری دستار کا زیب ہے اور بحمدہ اب تک تر و تازہ ہے!

ان کے گلے کے باسی ہار، دیتے ہیں بوٹے جانفزا
جن پر خزاں سی آ چلی، ہیں وہی گل بہار پر!

گونگا ہری

ٹھاکر اجیت سنگھ بہت غصّہ میں تھے، ان کے رئیسانہ غرور، کو حد درجہ صدمہ پہنچا تھا، ان کی شرافت مجروح ہو گئی تھی۔ اُن کی خاندانی نجابت کی نظر میں یہ قصور ناقابل عفو تھا۔ یہ دھبّا صرف خون بہا کر ہی دھویا جا سکتا تھا اسے درگذر کرنا بزرگوں کی روحوں سے شرمندہ ہونا تھا انھیں محسوس ہوتا ان میں سے ہر ایک ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہی ہے۔ بس اسی وقت فیصلہ ہوگا کہ اسلاف کا پاک خون اب تک اُن کی رگوں میں چھلکتا ہے یا وہ محض نام ہی کے سورج بنسی ہیں۔ بھلا بزرگوں کے وقت کسی شودر کی مجال تھی کہ وہ اُن سے آنکھ ملاتا۔ آنکھیں پھوڑ دی جاتیں، آج لاکھ بیسویں صدی ہو۔ بدیسیوں کا راج ہو، پر کیا اتنے گئے گذرے تھے کہ ان کی اکلوتی چاند سی خوبصورت اندرا، کو انھیں کی ریاست میں بسنے والے سنگتراش کا گونگا لڑکا

گھورے۔ اور اُس کی پتھر اور مٹی کی مورتیاں بنا بنا کر اپنے پاس رکھے!

دیوی اور دیوتا شودر کے گھر میں جانے سے نجس نہیں ہوتے، سورج دیوتا کا عکس گنگا جی اور گندے پانی میں یکساں طور پر پڑتا ہے، اس سے اُن کی جلا، اُن کی تربیت، اُن کی پاکیزگی پر حرف نہیں آتا۔ لیکن گندا نالہ آپ سے تو سورج کو اپنے میں نہیں اُتار لیتا، وہی چاہتے ہیں دکھائی دیتے ہیں۔ چاہتے ہیں اپنا منہ بادلوں میں چھپا لیتے ہیں، پھر تم لاکھ چاہو اُن کی جھلک نہیں دکھائی دیتی! پر یہاں تو اس گونگے شودر لونڈے نے، اُن کے چاند کی بے خبری میں اپنے سینے میں اسکی تصویر اُتار لی۔ پھر ڈھٹائی دیکھو کہ چھپاتے بھی نہ رہا۔ اس کی مورتی بنا بنا کے قصبہ بھر میں ڈھنڈورا پیٹتا رہا، گاؤں کے ٹھاکر کی بیٹی اور اس کی طرف نظر اُٹھائے کون کہ سنگ تراش کا لونڈا!

مانا کہ ابھی اندرا کا سن ہی کیا تھا، یہی دسواں سال، اور وہ لونڈا ابھی مشکل سے پندرہ سولہ برس کا ہوگا۔ مورتی بنانا، تصویر بنانا کوئی ایسا عیب نہیں، کسی کا محبت کرنا بھی بُرا نہیں، مگر بعض وقت محبت بھی ذلت محسوس ہوتی ہے، ہندوستانی شرافت اور راجپوتی غیرت یہ سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ بن بیاہی اکلوتی بیٹی پر ایک شودر لونڈا عاشق ہے۔

اُنھوں نے اسی لئے ہری کو پکڑوا بلوایا، دو پیادے اُس کو گھسیٹتے ہوئے لائے۔ پندرہ سولہ برس کا لڑکا گندمی رنگ، سر منڈا ہوا۔ بڑی سی چٹیا۔ دُبلا پتلا، فاقہ کش، چہرا زرد، منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی معمول سے زیادہ چوڑی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلکتے ہوئے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں فریاد کرتی ہوئی۔

ٹھاکر صاحب دیکھتے ہی برس پڑے "کیوں بے ..... تیری مجال، اتنی ہمت، کہ تو میری بیٹی کی مورتی بنا دے اور اُسے گلی گلی کوچے کوچے تشہیر کرے۔"

ہری، گونگا ہری۔ ہاتھ جوڑ کر غیں غیں کرنے لگا۔ خدا جانے کیا کہتا تھا۔ اپنی بیگناہی کا اظہار مقصود تھا یا جرم کا اقرار، ٹھاکر صاحب نے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اُنھوں نے قریب رکھی ہوئی بید کی چھڑی اُٹھائی اور سڑ سڑ کاچلے، راجپوتی ہاتھ کی قوت، بید کی لچک اور مضبوطی، ہری کا سوکھا ہوا جسم، معلوم ہوا صندل کے درخت پر کلہاڑے پڑنے لگے۔ وہ یوں ہی خوف سے لرزاں جھکا ہوا تھا، دو چار ہی ہاتھ میں زمین پر جامن کی بودی شاخ کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ اور کچھ اس بیتابی، بے چینی اور کرب سے تڑپا کہ دیکھنے والے بھی آبدیدہ ہو گئے۔ ظلم کا چلتا ہوا ہاتھ عواقب کے خیال نے تھام لیا۔ ہاتھ رُکتے ہی ہری بدحواس، روتا ہوا اور چوٹ کھائے ہوئے کتے کی طرح ہیں ہیں کرتا کوٹھی سے نکل کر بھاگا۔

اس نے اُس وقت تک دم نہ لیا، جب تک کہ قصبے کی سرحد سے باہر نہ نکل گیا، وہ اس طرح بھاگا۔ جیسے کبوتر بہری کے پنجے سے چھوٹ کر، اور فاختہ بلی کے مُنہ سے پھڑ پھڑا کر بھاگتی ہے،

غرور و نخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی! ..... محبت کی یہ باقاعدہ پسپائی نہ تھی، بلکہ وہ سراسیمگی کی بھگدڑ تھی۔ جو ہندوستان کی قسمت میں اکثر موقعوں پر مقدر رہی ہے، مادیت کے سامنے اکثر روحانیت یونہی بھاگ نکلتی ہے۔ تاریکی اسی طرح آفتاب کو زرد رو بنا کر جھکا دیتی ہے۔ کالی راتوں سے چاندنی اسی طرح فرار کر جاتی ہے، سیاہ و دراز زلفیں

اسی طرح افشاں کی پتلی لکیر کو ڈھک لیتی ہیں۔ظلمات اسی طرح آبحیات کو چھپا دیتی ہے!

داتا کی دین کی عجیب لیلا ہے۔جس طرح بخشش اُن سے عجب نہیں اسی طرح ہر ایک
کو تول تول کے دینا بھی اُنھیں کا کام ہے۔پھر یہ بھی دیکھئے اگر کسی سے کوئی چیز چھین لی تو
دوسری چیز دوسروں سے زیادہ دے دی۔کسان سے ریاست لے لی قناعت دے دی
غریب سے امیری لے لی سچائی دے دی!سرمایہ دار سے ایمان لے لیا۔عشرت دے دی!
پھول کو قوتِ پرواز نہ دی رنگ و بو عطا کر دیئے!ہوا کو صرصریت دی تو رنگ و بو غائب،
ہیرے کو چمک دی تو مشک کی سی خوشبو نہ دی!بلبل کو چہکنا دیا تو عقابی پر دارد غائب
عقاب کو آسمان سے آنکھ لڑانا سکھایا تو خوش گلوئی ندارد!
انسانی خصوصیات پر اگر ایک نظر ڈالیئے تو یہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دے گی،
جہاں عقل کم ہوئی دل بڑا سا دیدیا،جہاں عقل کی زیادتی ہوئی دل کی آواز مدھم پڑ گئی،جس
کو آنکھ نہ دی اس کا حافظہ تیز کر دیا جس کا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا!دوسرے میں دونوں کی
قوت دیدی،جس کے اعضا کمزور ہوئے دماغ تیز ہو گیا!
ہری کو بھی نطق کی عوض ایک خاص چیز عطا ہوئی تھی،ہاتھ میں سنگ تراشی کا خاص
سلیقہ اور دماغ میں اس فنِ لطیف کے ماہرین کا سا مادۂ ایجاد۔وہ ایک بے زبان ناتراشیدہ
ہیرا تھا۔جسے جوہر شناس نگاہوں نے ابتک پرکھا نہ تھا،ٹھاکر صاحب کی چھڑی نے دنیا پر یہ احسان
کیا کہ اس "کوہِ نور" کو خاکستر سے نکال کے باہر

ہری گھر چھوڑ کر بھاگا۔ اپنے قصبہ سے دُو دَینین کوس پر ایک برادری والے کے ہاں دُو تین دن ٹکا۔ ہلدی چونے سے جسم کی لیپ پوت ہوئی، پھر وہاں سے کچھ اوزار لیکر چل کھڑا ہوا۔ راستہ میں سل کوٹتا، مورتیاں بناتا، بنارس پہنچا۔ وہاں ہم قوموں کے ساتھ کچھ دنوں رہا۔ لوگ اگر اس کی بات نہ سمجھتے تو اپنا مدعا ہندی میں لکھ دیتا۔

اتنی ہندی اسے اندرا کی محبت نے سیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ سب اس کی کاریگری سے فائدہ اُٹھاتے۔ اور دو روپیہ کا کام لیکر ایک روپیہ دے دیتے۔ وہاں چند مہینے رہ کر اس نے اتنا کما لیا کہ وہ کلکتہ جا سکے۔ ایک ساتھی لیکر اسٹیشن پہنچا۔ اس کی مدد سے کلکتہ کا ٹکٹ لیا۔ اور ریل میں سوار ہو گیا۔

ہری اس سے واقف تھا کہ کلکتہ میں بنارس ڈویژن کی ایک نو آبادی ہے۔ ہوڑا چلے جائیے۔ آپ کو ہر قوم، ہر پیشہ، ہر مذہب کے اور ہر ضلع، ہر قصبہ کے آدمی مل جائیں گے۔ ہری پُرزوں پر لکھ لکھ کے دریافت کرتا ہوا ہوڑا پہنچ گیا، وہاں قصبہ ہی کے ایک شخص کے پاس ٹکا۔ اور کام کرنے لگا۔ ہر روز اپنے کھانے بھر کو کماتا اور شہر میں گھومتا پھرتا تسکین قلب ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس کا اس اژدہام میں کہیں پتہ نہ تھا۔

ایک دن اسے ایک مجسمہ ساز، بت تراش کی . . . . دکان نظر پڑی، وہ ٹھٹک کے باہر کھڑا ہو گیا، خوبصورت اور حسین مجسمے آئینوں میں سے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ مگر اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، اس وقت یہاں صاحب لوگ ہیٹ کوٹ پہنے ہوئے نظر آتے تھے۔ یا اُن کی لیڈیاں قیمتی گاؤن زیب جسم کئے! اس کو اندر جاتے ہوئے اس سے بھی زیادہ خوف

معلوم ہوتا تھا، جتنا کہ کالی جی کے مندر میں معلوم ہوا تھا، دیوی جی تو پھر بھی ذرا دیر میں خفا ہوں گی، ممکن ہے اسے شودر سمجھتے ہوئے بھی اس کے گونگے پن کی وجہ سے اس کی جسارت معاف کر دیں، لیکن یہ انسان جانتے ہوئے بھی کالا آدمی کہہ کر ممکن ہے مار بیٹھیں، پھر اگر یہی معلوم ہو کہ یہ لوگ ماریں گے ہی، تو کوئی ایسی بات نہیں، جو پیٹھ تھا کہ صاحب کی بید کی مار کھا کر نہ ٹوٹی تھی، وہ دو چار گھونسوں یا ٹھوکروں سے کیا ٹوٹے گی، خوف جو تھا وہ سزا کی صورت کے عدم تعین کا۔ نامعلوم کا ڈر انسانی دل کو موت سے بھی زیادہ لرزاں کر دیتا ہے۔ ہری کو کیا معلوم کہ اگر ایک گونگا سنگ تراش میلا سا کرتا پہنے، میلی سی دھوتی باندھے، ایک تھیلے میں اپنے اوزار کاندھے پر لٹکائے، ننگے سر، اُن کی دوکان میں داخل ہو، تو صاحب لوگ اس سے کیونکر پیش آئیں گے۔ ڈر کہتا یہاں سے بھاگ چلو! آرٹ کی کشش قدم اُٹھنے نہ دیتی، یہ اسی حیص بیص کی دلدل میں پھنسا گھنٹوں یونہی دوکان کے باہر کھڑا دیکھتا رہا، پچیسیوں آدمی کالے اور گورے آئے گئے، دوکان میں سے کچھ خریدا، کچھ آرڈر دیئے مگر یہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، مالک دوکان نے، جو ایک بنگالی تھے، اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی اور آدمی بھیجا کہ اندر بلا لاؤ ہری ڈرتا سہمتا اندر گیا۔ انھوں نے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو، کیوں اتنی دیر سے باہر کھڑے ہو؟"

ہری نے غیں غیں کر کے ان پر اپنا گونگا پن ظاہر کیا، اسی کے ساتھ اشاروں سے بتایا کہ وہ خود سنگ تراش ہے اور اُن کے ہاں کے مجسمے دیکھنا چاہتا ہے، دوکاندار چونکہ خود صناع تھے، اس لئے انھوں نے اس کشش فن کو محسوس کر لیا، جو اس وقت ہری کو اُن کی مورتیاں دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ خود اُٹھ کے کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے ہری کو مجسمے

دکھانا شروع کیا۔ وہ ہر مجسمے پر ٹھیک اسی مقام پر اُنگلی رکھ دیتا۔ جہاں باریک اور نازک کام کامیابی سے بنایا گیا ہو۔ گو وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا۔ مگر اس کے چہرے کی چمک، مالک دوکان کے لئے روحانی مسرّت کا اتنا سامان بہم پہنچا رہی تھی، جو شاید ان کی عمر بھر کے لئے کافی تھا۔ آرٹ صاحب فن سے داد چاہتا ہے، یہ وہ بھُوک ہے جو فن سے ناآشنا حضرات کی معمولی تعریفوں سے نہیں سیر ہوتی، یہ وہ پیاس ہے جو آرٹ سے ناواقف نہیں بجھا سکتا، مونی موہن بابو کی یہ بھوک اور یہ پیاس آج ایک کندہ ناتراش، دیہاتی سنگ تراش بصرف اپنی انگلیوں کے اشارے اور چمکتے ہوئے چہرے سے بجھا رہا تھا اور اُن کی داد لینے کی خواہش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ اب ہری کو وہی چیزیں دکھا رہے تھے، جو ان کے نزدیک اُن کے آرٹ کے اعلیٰ ترین نمونے تھے، بالآخر وہ اسے ایک مورتی کے پاس لے آئے جس پر اُنھوں نے ایک سیاہ غلاف ڈال رکھا تھا۔ یہ اُن کے فن کی تکمیل تھی، اُنھوں نے ہری سے کہا "دیکھو یہ چیز دیکھو۔" اور ڈرامائی انداز سے وہ غلاف الٹ دیا۔ ایک مرمری مجسمہ تھا۔ نسائیت کا مجموعہ، حُسن صورت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شرم و حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اجودھیا کی وضع کی ساری پہنے گھونگھٹ نکالے۔ لجانے شرمانے میں بھی ایک شانِ خودداری عیاں! نیچے لکھا تھا "سیتا!" ہری نے ہاتھ جوڑکر مُورتی کو پرنام کیا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ انگلی کے اشاروں سے چہرے کے کٹ، ساری کے بل ٹانگوں کی تراش کی تعریف کی مگر پاؤں کی اُنگلیوں پر آکر ٹھٹک رہا۔ مونی بابو نے پوچھا کیا ہے؟ کوئی عیب ہے؟ اُس نے کوئی جواب نہ دیا صرف چہرے سے وہ پچھلی بشاشت جاتی رہی، مونی بابو کو محسوس ہُوا واقعی انگلیاں بھدّی ہیں، وہ۔

ایسی عورت کی بن گئی ہیں جو تمام عمر ننگے پاؤں چلی ہو۔ حقیقت خواہ یہی ہو لیکن اس سے اس تخیل کو ٹھیس لگتی ہے، جو سیتا کے نام کے ساتھ ہندوستانی دماغوں میں راسخ ہے۔ ہری اس درمیان میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا تھا، اس نے اپنے تھیلے میں سے ٹٹول کر ایک چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی موستی کوئی آٹھ انچ بلند نکالی۔ اس نے کپڑے کی دھجیاں الگ کر کے وہ مجسمہ سیتا کی مورتی کی بغل میں رکھ دیا۔ ایک دس برس کی ہندوستانی گھر کی شریف لڑکی تھی، بلا کا تناسب اعضا، بھولاپن، الھڑپن، چلبلاپن، شوخی، شرارت، معصومیت، نسوانیت، بچپنا ہر شے اکٹھا، پھر عضو عضو سانچے میں ڈھلا ہوا یہ محسوس ہوتا تھا کہ صانع نے اس ایک مورتی پہ برسوں ریاضت کی ہے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے ہر دم اسی کے خیال میں محو رہا ہے۔ اس لئے کہ اس میں وہ حسن تھا، جو تخیل ہی بخش سکتی ہے، وہ لطافت تھی جو عشق ہی عطا کر سکتا ہے۔ اور وہ طہارت تھی جو ایمان و اعتقاد ہی میں دستیاب ہوتی ہے اگرچہ تو پتھر کی۔ مگر معلوم ہوتا تھا اب بولی اب بولی۔ بس تبسم پنہاں قہقہے کی آواز میں تبدیل ہوا ہی چاہتا ہے! مونی بابو اپنی مورتی بھول گئے، انھوں نے اس مورتی کو اٹھا لیا، دیکھنے لگے، دیکھتے رہے..... ان کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ تصویر کسی قدیم، بے نظیر، ہندی صناع کی بنائی ہے، شاید گپت زمانہ کے ان استادان فن میں سے کوئی ہو جنھوں نے اجنتا میں غیر فانی کمالات کے نمونے چھوڑے ہیں۔ انھوں نے ہری سے گھبرا کر پوچھا "تم نے یہ مورتی کہاں پائی؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا کہ میں نے بنائی ہے!

ان کو یقین نہ آیا۔ بولے "تم نے، ارے تم نے؟"

ہری مسکرا دیا۔ اُس نے اپنے اوزار تھیلے سے نکالے اور قریب ہی پڑے ہوئے سنگِ مرمر کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا اٹھا لیا۔ موتی بابو نے سیتا کی تصویر پر کپڑا ڈال دیا، دوکان پر کام کرنے والے آدمیوں میں سے ایک کو بلا کر کہا "تم لوگ گاہکوں کو دیکھنا اس گوشے میں کوئی نہ آئے" انھوں نے ایک اوٹ لا کے اس طرح کھڑا کر دیا کہ وہ حصّہ دوکان سے علیحدہ تخلیہ کا مقام ہو گیا اور خود سگار جلا کے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

ہری تین گھنٹے مسلسل مورتی بنانے میں لگا رہا، ہاتھ اس قدر صفائی اور نرمی سے چلتا تھا کہ موتی بابو کو حیرت ہوتی تھی، وہ خود ہندوستان کے سب سے بڑے بت سازوں میں سے سمجھے جاتے تھے، اُنھوں نے اب تک بلا مبالغہ ہزاروں مجسمے بنا ڈالے تھے۔ مگر اس لڑکے کی سی پتھر میں زندگی پیدا کر دینے کی صلاحیت ان میں مطلقاً نہ تھی۔ پھر لطف یہ کہ نہ تو کہیں ناپا، نہ نشان بنائے اور نہ جس کی مورتی بن رہی تھی وہ ہی سامنے تھی۔ تین گھنٹہ میں دوسری مورتی تیار تھی، اسمیں شک نہیں کہ وہ پہلی مورتی سی بات اس میں ہو بہو پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن چند گھنٹوں کے کام نے موہنی بابو کو اس امر کا یقین دلا دیا کہ پہلی مورتی بھی اسی گونگے ہی کی بنائی ہے۔ ان کے دل نے تسلیم کر لیا۔ کہ اس سے بڑا صناع ہندوستان نے اسوقت تک نہیں پیدا کیا۔

موتی بابو کی آنکھوں نے اپنی بین الاقوامی شہرت، کمال اور فن میں مہارت تامہ اس جاہل گونگے دیہاتی کے قدموں میں ڈالدی۔ گلک قدرت نے اپنی خوبیاں، اپنی صلاحیتیں اسکے بھدے ہاتھوں میں منتقل کر دی تھیں۔ ان کا کمال مصنوعی تھا۔ اس کا خلقی و وہبی! ان کا انسانی تعلیم کا نتیجہ تھا، اس کا قدرت کا ودیعت کردہ! مقابلہ جسارت تھا اور غبطہ کمی ایمان کی دلیل

اُنھوں نے ہری کو گلے سے لگا لیا، بھرائی ہوئی آواز میں پُوچھا "میرے ساتھ رہو گے ؟" وہ کِھلتی ہوئی کلی کی طرح مُسکرایا۔ حاجی کے لئے کعبہ میں اقامت کی دعوت تھی۔ یاتری کے لئے کاشی میں رہنے کی استدعا، تھکے ماندے مسافر کے لئے منزلِ مقصود میں قیام کرنیکی خواہش داتا کے دین کی لیلا!

ہری نے مونی بابو کا پاؤں تھام لیا!

پھسلتے ہوئے برف کے ٹکڑے کو پہاڑ کا سہارا مل گیا!

مونی بابو نے نہ شادی کی تھی، نہ اُن کے کوئی اولاد تھی، اُنھوں نے ہری کو لڑکے کی طرح رکھا۔ انگریزی معلموں سے بہترین تعلیم دلوائی، بڑے بڑے ڈاکٹروں کو گونگے پن کے علاج کی طرف متوجہ کیا، بالآخر اسے اپنے ساتھ امریکہ لے گئے، وہاں کے مشہور ترین سرجن نے گونگے کو زبان بخش دی، ہری ایک ہلکی سی ہکلاہٹ کے ساتھ بولنے لگا، مونی بابو کو دونوں جہان کی نعمتیں مل گئیں۔ اُنھوں نے مادرِ ہند کے سب سے بڑے سنگتراش کو معرکتہ الآرا غیر فانی مجسمے دکھائے دنیا کے عظیم ترین صنّاعوں سے ملاقاتیں کرائیں اور اُن کی دوکان میں ہری کے آنے کے ٹھیک دس برس بعد، اُسے ایک مکمل انسان بنا کر ملک و قوم کی خدمت کیلئے ساتھ لیکر پلٹے۔

وہی دکان تھی وہی مونی بابو اور وہی ہری شخصیت وہی روح وہی جسم وہی لیکن دماغ جو پہلے ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ اب ایسا سجل، اتنا درست، اتنا خوش آب بن گیا تھا کہ مادرِ ہند کی درخشاں پیشانی پر آویزاں کیا جا سکتا تھا!

اُن کی دوکان پر اب، کلکتہ ہی کے آرڈر نہ آتے تھے، بلکہ تمام ہند کے، اقصائے عالم کے، جو چیز پیرس و اطالیہ، انگلستان و جاپان میں میسر نہ تھی، وہ اس کلجگ میں بھی ہندوستان، پیارے ہندوستان کو ہری کی بدولت نصیب تھی۔ حُسن اس کی جاگیر تھا، تخیل اسکی ملکیت، صنعت اس کی لونڈی اور سنگ تراشی اس کا آلہ کار! وہ دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں بناتے بناتے خود ہی دیوتا بن گیا تھا۔ لوگ اس کا نام لیتے، تو اسی عزت، اسی محبت اور اتنے ہی احترام سے، جس سے دیوتاؤں کا۔ اُسے خوش ہونا چاہیئے تھا۔ اُسے گھمنڈی ہونا چاہیئے تھا۔ اُسے اپنے پر ناز ہونا چاہیئے تھا،

لیکن......

لیکن جب دن بھر کے تخلیقی کاموں، اور ہزاروں آدمیوں سے طرح طرح کی تعریفیں سننے کے بعد، وہ اپنے کمرے میں جاتا، تو سرہانے کے طاق پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹاتا۔ ایک دس سالہ لڑکی کے مجسمہ کو حسرت سے دیکھتا، عقیدت کے پھول چڑھاتا۔ محبت کی شمع جلاتا۔ اور گھنٹوں کی پرستش کے بعد اپنے دل میں ایک روحانی تسکین محسوس کر کے سو رہتا۔ صبح سویرے جب چڑیاں میٹھے سُروں میں چہکنا شروع کر دیتیں مسجدوں سے اذان اور مندروں سے گھنٹوں کی آواز سنائی دیتی، آنکھیں بند کئے طاق تک آتا، اپنی دیوی کے چہرے پر سب سے پہلے نگاہ کرتا۔ ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا۔ اس کے چہرے کی مسرت سے خوش ہو کر اپنے میں نئی نئی طرح کی قوتیں محسوس کرتا۔ اور دُنیا کے لئے کوئی نادر بدیہ تیار کرنے چلا جاتا تھا۔

موتی سا سرپرست سر پر تھا۔ ہاتھ میں صناعی کی بے انتہا قوت تھی، دنیا کے ہر گوشے

میں نام تھا۔ پھر بھی دل خالی تھا، خیال تصویر میں اپنے چھیلتے رنگ بھر دیتا تھا۔ لیکن شباب کی گرمی، نسائیت کی آتشِ سیال مقصود تھی، روح اپنا شریکہ، اپنا جوڑا ڈھونڈھ رہی تھی؛ وہ بات مورتی میں کہاں؟

ایک دن دوکان کے سامنے ٹیکسی آکر رُکی، اندرا ہمہ حسن، ہمہ شباب، ہمہ رعنائی بنی ہوئی اُتری، ٹھاکر صاحب بھی ساتھ تھے، بیٹی گریجویٹ ہو چکی تھی شادی کی فکر تھی خواہشمندوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن اسے کوئی پسند نہ آتا تھا، خود نہ سمجھتی تھی کہ کیا چاہتی ہے۔ بس ایک خلش تھی۔ جیسے دل کا مندر سونا ہو، لاکھ تصویریں اس میں رکھو، لیکن کوئی ٹھیک نہ اُترتی، پرمیشور نے کوئی دیوتا اس کے لئے بھی ضرور بنا رکھا ہے، مگر وہ کہاں ہے۔ اس کا علم نہیں، جگہ جگہ بوڑھے انگلیوں پر ناچنے والے، باپ کو لئے پھرتی جستجو اپنے دل کے دیوتا کی تھی، بہانہ بڑے شہروں کی سیر کا تھا، کلکتہ اسی لئے آئی تھی، پھر وہاں آکر موتی بابو کی دوکان نہ دیکھنا، ہری بابو مجسمہ ساز کی زیارت نہ کرنا، ایک فنی معصیت ہوتی جس کا ارتکاب اندرا سی صاحب ذوقِ سلیم، تعلیم یافتہ خاتون سے ناممکن تھا۔

وہ ٹھاکر صاحب کو لئے ہوئے دوکان میں داخل ہوئی، ہری اس وقت ایک عیسائی کی فرمائش سے حضرت مریم کا ایک مجسمہ تیار کر رہا تھا۔ وہ تخیل پر زور دے کر اس بُت کے خط و خال میں حد درجہ معصومیت پیدا کر رہا تھا، کہ دفعتہً نگاہ اُٹھی اور اندرا نظر آئی، معلوم ہوا جیسے دیوتاؤں نے فردوس نگاہ کے لئے کوئی اندر کے دربار کی پری بھیجدی ہے۔ وہ اسے

نصف منٹ تک نہ پہچان سکا، کلی پھول بن گئی تھی، ہلال بدرِ کامل ہو گیا تھا، صبح کا شنگرفی آفتاب اب مہرِ نصف النہار تھا، آنکھوں کی خیرگی آہستہ آہستہ رفع ہو گئی، دل نے پہلے ہی پہچان لیا تھا، اب آنکھوں نے بھی اچھی طرح دیکھ لیا، سر سے پاؤں تک، دل زلفِ سیاہ کے ہر بال میں، خط و خال کی ہر بانکپن میں، ساری کے ہر بل میں، بیل کے ہر پھول میں اٹکتا رہا، بارے پورا سرو سا قد دیکھ لیا گیا، نظر قدموں میں آ کر جم گئی، وہی کنول سے پاؤں جن کا مثل نہ بنانے کی وجہ سے مونی بابو سے تعارف کی ابتدا ہوئی تھی۔ دل وہیں لوٹنے لگا، مونی بابو نے اس درمیان میں آنے والوں کا استقبال کر لیا، اُن سے ٹھاکر صاحب سے شناسائی تھی، اُنھوں نے بے تکلفانہ اندرا کی ہری سے ملنے کی خواہش کا ذکر کیا، مونی بابو نے ہری کو پکارا، پھر یہ بڑھے کچھ وہ، تعارف ہو گیا، نہ تو اُنھیں اندرا نے پہچانا اور نہ ٹھاکر صاحب نے البتہ ......

البتہ اندرا کی بار بار دزدیدہ نگاہی یہ کہتی کہ وہ اپنے من کے مندر میں اس دیوتا کو مختلف صورتوں سے بٹھا کر دیکھ رہی ہے، کسی فیصلہ پر، نتیجہ پر، پہنچنا ہی چاہتی ہے۔ مگر دوکان پر اس کا قطعی طے کرنا محال تھا، ہوٹل کے کمرے کی تنہائی میں، رات کے سونے کے وقت، پلنگ پر کروٹیں بدل بدل کر یہ مرقع مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا تھا، اندرا نے اس کی کوشش کی، تقریباً ہر روز اب دوکان پر آتی، ایک نہیں کئی مورتیاں بنوائی جا رہی تھیں، بظاہر اُن کے متعلق کوئی نہ کوئی بات بنانا، اُن کی تیاری کی مختلف منزلیں دیکھنا ضروری تھا، لیکن اصل میں ہری بابو کی شُستہ و رفتہ، علم و ہنر سے بھری ہوئی

گفتگو میں ہلکی سی ہکلاہٹ کی آمیزش سننا پسند تھا جب وہ ہکلاتا تو ایسا معلوم ہوتا
کہ دودھ اور شہد کا چشمہ رواں ایک ہلکے سے پتھریلے ٹکڑے سے اُلجھتا ہوا گذر
رہا ہے، اس میں وہی دلآویزی تھی جو بڑے گویوں کے ہاں گٹکری میں پیدا ہوتی ہے، وہی
جو پیارے صاحب کے ریکارڈ میں "منادی" کے لفظ میں موجود ہے۔ یہ ہکلاہٹ ویسی ہی بھلی،
اُتنی ہی رسیلی، اسی قدر دلفریب تھی جتنا کہ چھوٹے بچوں کا تُتلانا علم و ہنر کے ساتھ معصومیت
کی یہ آمیزش من موہے لیتی تھی۔ اندرا جس چیز کی اتنے دنوں سے جستجو کر رہی تھی وہ اس نے
پالی! فریم میں تصویر ٹھیک اُتری، مندر میں دیوتا براجمان ہو گئے! ہری، چند دنوں کے لئے
اپنی نسلی خرابی اور ٹھاکر صاحب کی نسبی برتری بھول گیا، وہ تو اندرا کا بچپن ہی سے دیوانہ تھا،
اس نے موقع پاتے ہی اس طرح خلوص، ایثار، اور حاضر باشی دکھائی کہ اندرا بھی اُس کی
دیوانی ہو گئی، ٹھاکر صاحب نے اس کی یہ کیفیت محسوس کی، اُنہیں فکر دامن گیر ہوئی، کلکتہ کا
شہر، پرایا دیس، بے جانے بوجھے لوگ، کس سے صلاح لیں، کس سے مشورہ کریں، بالآخر
موتی بابو سے ایک دن بچاڑ پر بُلا کر، پوچھ بیٹھے کہ "ہری کون ہے، کیا ذات پات ہے" انھوں
نے کہا، "میں ذات پات کچھ نہیں جانتا، ایک سنگ تراش کے بھیس میں آیا تھا، میری دانست
میں تو کرشن نے نیا روپ لیا ہے، اُن کے سوا دیوتاؤں میں بھی کوئی فنونِ لطیفہ کا اتنا ماہر نہیں!"

ٹھاکر صاحب ذرا چراغ پا ہوئے، راکھ کے ڈھیر میں ابھی چنگاری باقی تھی۔ بولے
"بابو صاحب ہم راجپوت ہیں، ایسے ویسوں کو بیٹی بہن نہیں دیتے۔ آپ کی بات سے تو
معلوم ہوتا ہے کہ شودر ہے؟"

موتی بابو بھی جھلا گئے۔ پاؤں کے نیچے دبنے پر چیونٹی بھی کاٹتی ہے، وہ بولے۔

"ٹھاکر صاحب شودر اور چھتری، اچھوت اور چھوت سب پرمیشر ہی کے بنائے ہوئے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے ایک صدیوں کا مظلوم ہے اور دوسرا صدیوں کا ظالم، ایک کمزور تھا دوسرے نے دبا لیا۔ اب اس صدی میں یہ زور و ظلم نہیں چلنے کا۔"

ٹھاکر صاحب کھڑے ہو گئے۔ بولے "میں اپنی لڑکی کا اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ دوں گا۔ مگر اسے کسی بدقوم کمینے سے بیاہ نہ کرنے دونگا" موتی بابو نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "ٹھاکر صاحب، ہری آپ کی لڑکی کو تو کیا۔ اندرلوک کی اپسرا کو بیاہ سکتا ہے، آپ کو اپنی شرافت مبارک، آپ سوکھی ہوئی ہڈیاں چچوڑ رہیے۔ علم و ہنر کے بادشاہ جسے اپنے پہلو میں بٹھا لیں، برہمنیاں اور راجپوتنیاں اُن کے پاؤں نہیں چھو سکتیں!" غرض محلے میں رہنے والے دو مرغوں کی طرح دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب زخم دہاں دیئے اور اپنی اپنی جگہ گردن پھلا پھلا کر چلے آتے۔

وہاں اندرا اور ہری سینما میں تھے، جب وہاں سے ٹیکسی میں پلٹے تو ہری نے اندرا کی ایک نظر سے یہ سمجھ لیا کہ اس کی ریاضت کے باغ میں پھل آ گیا۔ دیوی نے چڑھاوا قبول کر لیا۔ منت بر آئی، مگر ایک لمحہ کی حیاتِ جاوید بخشنے والی خوشی کے بعد، دفعتہً وہ قوم و نسل کی دیواریں یاد آ گئیں۔ جو درمیان میں حائل تھیں، اس نے اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو فولادی پنجہ سے روکا۔ اندرا کی نشست کا انداز، اس کا ہری کی طرف بار بار دیکھنا، یہ صاف صاف بتا رہا تھا کہ دیوی پوجاری کا مدعا سننے کی منتظر ہے۔ وہ عقدہ براری کے لئے ہمہ تن

تیار ہے۔ مگر ہری اس طرح خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے مجال سخن نہ ہو۔ وہ زبان پانے پر بھی گونگا بن گیا۔ اندرا کو یقین ہو گیا کہ اسے دھوکا ہوا، اس کا منہ رسوا ہی رہے گا، اس نے کھڑکی کی طرف منہ کر لیا، اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے! جب ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی تو ہری اسے اُتار کر پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اندرا نے پوچھا "بابو جی سے نہ ملئے گا" وہ بولا اس وقت معاف فرمایئے اب کل! اس نے سلام کرکے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا حکم دے دیا۔

افسردہ دل اندرا جب ہوٹل میں پہونچی تو ٹھاکر صاحب اپنے کمرے میں منتظر ملے۔ تمتمائے ہوئے چہرے سے سخت آواز اور تلخ لہجے میں بولے "میں ہری بابو کے ساتھ تمہارا گھومنا نہیں پسند کرتا، نیچ کمینہ!"

اندرا ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی، اس نے بھی باپ ہی کے تیور سے پوچھا "وہ نیچ اور کمینہ کیسے ہو گئے!"

وہ بولے "سنگ تراش کا لونڈا ہے، بالکل اسی طرح کا جیسا کہ وہ گونگا بدمعاش تھا نا! وہی جسے میں نے بیٹ کے گاؤں سے نکال دیا تھا" اندرا جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی، دل میں جو کھٹک تھی دفعتہً جاتی رہی، اس نے ہری کو پہچان لیا، یہ وہی پرانا پجاری، وہی خاموش عبادت گذار ہے۔ پہلے گونگا تھا۔ اب بھی ہکلا ہے۔ اُسے یاد آیا، کہ کہیں نہ کہیں اسکے سوانح کے سلسلے میں اس نے پڑھا تھا کہ ہری کبھی گونگے تھے یہی وجہ تھی کہ آنکھیں اُن کی خواہ کچھ بھی کہیں، لیکن زبان سے اظہار مدعا کرتے ڈرتے تھے، ٹھاکر صاحب کی بید کا ڈر جسم سے بڑھ کر روح میں سرایت کر گیا تھا، بس، بس، نگینہ جہاں سے گرا تھا، انگوٹھی میں وہیں ٹھیک

بیٹھ گیا، وہ ایک بار روحی انبساط سے مسکرا دی، دنیا کتنی خوش آیند اور کتنی موسیقیت سے لبریز ہے! پھر باپ کے گلے میں باہیں حمائل کر کے بولی،" آپ بیکار ان باتوں پر دل کڑھاتے ہیں، میں تو ان چیزوں کو مانتی ہی نہیں!" اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکیں وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن دوکان کھلتے ہی وہاں وہ موجود تھی۔ ہری نے رات بھر دل سے جنگ کرنے میں گذار دی تھی، مونی بابو نے ٹھاکر صاحب سے گفتگو کا خلاصہ سنا دیا تھا، ہری نے اپنی اصلیت بتا دی تھی۔ دونوں مایوس تھے، دونوں کو یقین تھا کہ ہندوستانی ذات پات کا آہنی قلعہ محبت کے انچھروں سے فتح نہیں ہونا، پروگرام طے ہو گیا تھا، کہ پسپائی کی ٹھہرے اور یورپ و امریکہ میں سیر ہو، اندرا کے دفعتًہ آجانے نے دونوں کو پریشان کر دیا، مونی بابو بوڑھے تھے۔ اختلاج کا شکار ہوئے اور پاس والے دواخانہ میں دوا پینے چلے گئے۔ ہری ہمہ تمنا ہمہ مایوسی، ہمہ آرزو، ہمہ حسرت بنا ہؤا، کوہستانی استقلال سے ڈٹا رہا۔ وہ بھاگنا بھی چاہتا تو اندرا سے کہاں بھاگ کر جاتا؟ اس نے رسمًا سلام کر کے پوچھا " فرمائیے کیا حکم ہے؟"

اندرا نے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا،" پتا جی کا اصرار ہے کہ اب مجھے گھر چلنا چاہیئے۔ اس لئے میں نے کہا چلوں آپ سے مل لوں اور اس دوکان کی وہ چیزیں بھی دیکھ لوں جو آپ نے مجھے اب تک نہیں دکھائی ہیں۔"

ہری نے زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا،" تو آپ آج ہی تشریف لیجا رہی ہیں۔"

اس نے کہا "نہیں آج تو نہیں، لیکن وہ ہی ایک روز ہیں!..... تو مجھے وہ چیزیں تو دکھایئے جو میں نے اب تک نہیں دیکھی ہیں!"

ہری نے کہا "ساری چیزیں آپ کے سامنے ہی ہیں۔ آپ ان میں سے ہر ایک کو کئی بار ملاحظہ فرما چکی ہیں!"

وہ ہنسی، اس کی ہنسی سے دلی بےچینی چھپانے کی کوشش ظاہر ہوتی تھی، اس نے کہا "میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے سارے کمالات دکھا دیئے ہیں!"

ہری نے کہا "میں سچ کہتا ہوں کہ کوئی ایسی چیز....." اس جملے کو وہ ناتمام چھوڑ کر رک گیا، وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا، اس کی پیشانی پر عرق آ گیا۔ اس نے زبان دانتوں سے دبالی۔ اندرا پھر ہنسی، اس کی ہنسی سے صاف فاتحانہ جھلک آ رہی تھی! وہ زینہ کی طرف اشارہ کر کے بولی "یہ زینہ تو آپ ہی کے کمرے میں جاتا ہے نا!"

ہری نے گھبرا کر کہا "جی ہاں"

اس نے اس طرف بڑھتے ہوئے کہا، تو آیئے آپ مجھے اپنے کمرے کی چیزیں دکھایئے ہری کچھ سہما کچھ شرمایا سا ساتھ ہولیا، وہ کھٹ کھٹ کرتی اوپر چڑھ گئی۔ پہلا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ دروازہ کھول کے جھانکا بند کر دیا، دوسرا کمرا ہری کے سونے کا کمرا تھا، اس نے کواڑ کھولے۔ ہری نے بڑھ کر کہا "جی یہ میرے سونے کا کمرا ہے آپ اسے دیکھ کر کیا کریں گی۔"

وہ پھر ہنسی، اس طرح ہنسی جس طرح بلبل گل سے ہم آغوش ہو کر ہنستا ہے، اس طرح جس طرح دشمن کے بم پھینکنے والے ہوائی جہازوں کو گرا کر فوجی قدر انداز ہنستے ہیں، اور وہ

درانہ اندر چلی گئی، سادا سا بستر، صاف اجلی چادر، پردوں کے دو تکئے، پائنتی ایک قیمتی رگ، پلنگ کی بغل میں ایک ڈریسنگ میز ایک کرسی، میز پر برش کنگھے اور دو ایک قسم کے تیل کی شیشیاں، وسط دیوار میں ایک دروازہ تھا اُسے کھول کر دیکھا حمام کپڑے بدلنے کا کمرہ تھا، پلٹی چاروں طرف نظر دوڑائی، طاق پر نظر پڑی، اس پر چھوٹا سا مخملی زرکار پردہ پڑا ہوا دیکھ کر مسکرائی۔

ہری بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اندرا نے پلٹ کے پوچھا "یہ کیا ہے!"

وہ ہکلا کے بولا "میرا راز ہے!"

اس نے بڑے دعوے سے پوچھا "مجھ سے بھی!"

ہری نے پھر ہکلا کے کہا "آپ ۔ ۔ ۔ ۔ پ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے سب سے زیادہ!"

اس نے آنکھوں سے بجلیاں گرا کے دریافت کیا "اور اگر میں جانتی ہوں تو!"

ہری نے جلدی سے آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ جھپکاتے ہوئے جواب دیا "تو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت!"

اس نے عجیب شوخی سے، عجیب شرارت سے، عجیب ظرافت سے، عجیب دلربائی سے گھبرائے ہوئے ہری کو منہ چڑھا کر ہنسا دیا۔ اور خود طاق کے پاس جا کر پردہ الٹ دیا۔

وہی ایک مرمریں ٹکڑے پر دس برس کی ایک لڑکی کا مجسمہ!

اندرا نے دونوں ہاتھوں سے اس مورتی کو اٹھا لیا، اس کے گلے سے شام کا چڑھایا ہوا باسی ہار نکال لیا، اور اسے اپنے جوڑے میں رکھ کر بولی "اب تو آپ گونگے نہیں ہیں!"

ہری نے محسوس کر لیا کہ وہ اچھی طرح پہچان گئی ہے اور اس پر بھی وہ اظہار مدعا کی

اجازت دیتی ہے، پھر بھی ہمت نہ پڑی، پہلو بدل کر سوال کیا: "آپ کو کب معلوم ہوا"

وہ بولی: "کل رات بابوجی کی باتوں سے مجھے سب یاد آگیا۔" ہری نے کہا: "کیا اس کے بعد بھی آپ کو میرے آج تک گونگے رہنے پر کوئی تعجب ہوتا ہے؟"

وہ بولی: "ہاں اس لئے کہ دیویاں جب کسی کی منت براری کرنا چاہتی ہیں۔ تو پھر اُنھیں حاجت مند کی خاموشی بُری معلوم ہوتی ہے۔"

ہری نے کانپ کر کہا: "دیوی! دیوی! میں کیسے کہوں کہ میں تمھاری پوجا کرتا ہوں اور صبح کو اسی کی زیارت کرکے کام شروع کرتا ہوں! لیکن میں شودر ہوں، تم راجپوتن ہو ٹھاکر صاحب اگر سن لیں گے تو میرا کام تمام ہی کر دیں گے!"

وہ ہنسنے کی جگہ متین ہو کر بولی: "تم اور شودر! تم تو دیوی دیوتاؤں کے بنانیوالے ہو، اور اب ...... اب ایک پوتر راجپوتن کے دیوتا!" ہری نے گھبرا کر کہا: "ارے ٹھاکر صاحب کیا کہیں گے؟" وہ مسکرا کر بولی: "ان سے اتنا مت ڈرو۔ اُن کو بھی منالوں گی، اور اگر نہ بھی مانے تو کیا! بیٹی کی حیثیت سے اکیس بائیس سال تک باپ کی خدمت کرچکی، اب استری بن کے اُس کی سیوا کروں گی، جو آج دس سال سے ہر روز گلے میں محبت کی مالا ڈالتا ہے؟"

ہری نے اندرا کو اسی عزت، اسی احترام، اسی محبت سے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ جس سے وہ اس کی مورتی کو روزانہ پرنام کیا کرتا تھا، اور اندرا نے جھک کر ہری کے پاؤں چھو لئے! ٭

بیوی

ڈاکٹر منور خوش فہم بھی تھے اور خوش رو بھی، ستائیس برس کا سن، چڑھتی جوانی، آکسفورڈ
کے بی۔ ایس۔ سی، لیڈز کے پی۔ ایچ۔ ڈی، لندنی فیشن کپڑوں میں، کرزنی وضع چہرے کی؛
اور شوپنہار و ڈارون کے نظریئے دل و دماغ میں! پھر اس پر خلیق، خوش گفتار بھی، خوش
رفتار بھی، جامہ زیب بھی۔ ماں باپ یورپ سے واپسی کے پہلے ہی مر چکے تھے، تقریباً ایک
لاکھ کی جائداد ملی تھی، نہ کوئی بھائی تھا نہ کوئی بہن تھی، بزرگوں میں لے دے کے ایک رشتے
کے چچا ہوتے تھے وہ بھی ملازم تھے، کارپرداز تھے، اتالیق نہ تھے! خوردوں یا برابر والوں
میں جو کچھ بھی کہو، ایک اللہ کی بندی سلمٰی تھی، وہ شرع و آئین کی رو سے بیوی تھی، اس لیئے
کہ عقد ہو چکا تھا، مگر رسم و رواج کی بنا پر اب تک غیر مخض تھی، اس لئے کہ بیاہ نہ ہوا تھا۔

ڈاکٹر منور جو یورپ سے واپس ہوا تو عورت سے متنفر، اس کے حقوق سے یکسر غافل اس کی ضرورتوں کے محض حیوانی حدود تک کا قائل اور اس کے مساوی خیالات سے حد درجہ خفا! وہ کہتا: عورت ایک مغربی پھول ہے۔ اس سے وقتی مسرت حاصل کر لو، اسے گلے کا ہار نہ بناؤ۔ ورنہ یہ نازک پنکھڑیاں کچھ ہی دنوں میں خار مغیلاں بن جائیں گی“۔ ایک دوسرے موقع پر اس نے کہا۔ ”عورت ناگن ہے، بڑی ہی خوبصورت، بڑی ہی نازک، بڑی ہی سبک مگر بڑی زہریلی! اس سے بھاگو، دور بھاگو۔ ورنہ اس کا کاٹا بچتا ہی نہیں!“ ایک بار اس صنف کی یوں تعریف کی ”عورت شیرنی ہے۔ حسین جسم والی، نازک کمر والی، نرم جلد والی، مگر بلا کی خونخوار اور آفت کی تیز دنداں!“ ایک دفعہ یوں گہر پاشی کی ”عورت ایک کسی ہوئی تیغ ہے جس پر گری اس کا خون چاٹ گئی، جدھر چمکی آنکھوں کو خیرہ کر گئی، جس جانب جھکی، اسطرف صفائی کر دی، جس سے گلے ملی اس کو موت سے گلے ملا دیا“۔

اگر کسی نے کہہ دیا کہ ”بہت ہی عمدہ شاعری کی، اچھی تشبیہیں تلاش کیں“۔ تو پھر ڈاکٹر منور ہاتھ دھو کر آستینیں چڑھا کر پیچھے پڑ جاتے تھے۔ ”علم الحیوان“، ”علم الابدان“ یا ”علم طبیعات“ اور خدا معلوم کن کن علوم سے دوران تقریر میں مثالیں، نظریے اور مقولے اس بہتات سے پیش کر دیتے تھے کہ غریب معترض گھبرا اٹھتا تھا، اور ساکت ہو کے سر نہ اٹھاتا تھا۔ اس سکوت پر ڈاکٹر منور ایک خندۂ تحقیر آمیز کے ساتھ کہتے ”حضرت! آپ جن نظریوں پر عمل پیرا ہیں وہ سب جذباتی ہیں، آپ عورتوں پر آج کل کی جدید ترین تصنیفیں دیکھئے اور اگر ان تک دسترس نہ ہو، تو کم از کم ”ہیولاک ایلیس“ کی کتاب تو پڑھ ہی لیجئے، آپ کو اس کے

دیکھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ عورتوں کی فطری خواہش اور طبعی میلان کیا ہیں، اور ان کے اس حسین خول میں کس بلا کا ابلیس بھرا ہے۔"

غرض تمام عقلی و نقلی دلائل کی تان اسی پر ٹوٹتی کہ عورت اور حیوانات میں صرف صورت کا فرق ہے۔ اور وہ حد درجہ کیاد، مکار، حیلہ جو، فتنہ پرداز ہیں۔ ان کا وجود مرد دل کی یکسوئی قلب کا دشمن ہے، اور انھیں طرح طرح کے آلام میں، مصائب میں، گرفتار کرانے کا باعث!

جب اس طرح کے خیالات ہوں۔ ماں باپ سر پہ نہ ہوں، کوئی دبانے والا بزرگ خاندان میں نہ ہو، اور روپیہ وافر ہو، تو عقد کے سورۂ اخلاص پر بیاہ کا جزدان کیوں کر چڑھایا جا سکے۔ گویا تدبیر منزل کے لحاظ سے، منور، برگد کا وہ تازہ تنا تھا جو اصل سے جدا کر کے حال ہی میں نصب کیا گیا ہو، نہ وہ خود سرسبز ہو اور نہ اس کی گھنی چھاؤں میں کوئی لُو، دھوپ کا مارا آرام پا سکتا ہو!

یورپ کی ہوا کھایا ہوا مسافر جس طرح دو چار سوٹ ٹائیاں، اور کئی درجن جوتے ساتھ لاد لاتا ہے۔ اسی طرح قصّوں، کہانیوں، چٹکلوں اور لطیفوں کا بھی ایک ذخیرہ اس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ یہ چیزیں سوسائٹی ہی میں، دو چار دس آدمیوں کے مجمع ہی میں کچھ مزا دیتی ہیں اسی لئے لوگوں سے ملنا جلنا، دعوتیں کھانا، پارٹیاں دینا ایسے اشخاص کی زندگی کا جزوِ اعظم بن جاتا ہے۔ منور کے ہاں تو خدا کا دیا سب کچھ تھا، اس نے اپنی سوسائٹی بنائی اور کچھ مفت خوروں نے اس کو اپنی سوسائٹی کا مرکز قرار دیا۔ گھر پہ دعوتیں ہوتیں، چائے پارٹی ہوتی، برج ہوتا، فلش ہوتا

شطرنج ہوتی، باہر موٹر پر ہوا کھائی جاتی۔ سینما دیکھا جاتا۔ تھیٹر کی سیر ہوتی، اور گھوڑ دوڑ میں بازیاں لگائی جاتی تھیں "صاحبیت" کی یہ سب بدیہی نشانیاں ہیں، اور امارت کی یقینی علامتیں! بھلا ایک یورپ زدہ "سرٹیفکیٹ یافتہ، بی-ایس-سی، پی-ایچ-ڈی، ان سے کیوں کر احتراز کر سکتا تھا؟ پھر بھی انھیں یار دوستوں نے دو چار بار سلسلۂ گفتگو میں گھر بسانے اور شادی کی رسم ادا کرنے کی ترغیب دی۔ منور نے تیوری چڑھا کر جواب دیا:۔

"میں ایسا بے وقوف نہیں! اپنی آزادی کیوں کھودوں اور مفت کی بلا کیوں مول لوں؟" ناموس کی عزت کا خیال دلایا گیا تو سختی سے جواب ملا "جب میں سلمیٰ کو اپنی ناموس اور عزت سمجھوں جب نا! پھر عصمت و عفت اضافی چیزیں ہیں، میرے نظریئے اور اصول ہندستانی نہیں، مجھے ان چیزوں کی پروا نہیں!" عورت کی ضرورت، اس کی خدمت، اطاعت، ہمدردی، انسانیت، ایثار اور بے نفسی کا کون ذکر کرتا؟ وہ بار بار ان تمام امور کا مضحکہ اڑا چکا تھا، بار بار ان کی تردید کر چکا تھا، "بڑا صاحب" تھا اس کے منہ کون لگتا۔ یاران طریقت کو اس کی کیا پڑی تھی؟ ان کا فائدہ بھی اسی میں تھا کہ منور یوں ہی بن بیاہا رہے۔ شادی ہو جانے، بیوی آ جانے پر خدا جانے کون کون سے شوق ترک کر دے! ممکن ہے بیگم صاحبہ اخراجات میں قطع و برید شروع کر دیں، برج بھی بند ہو جائے اور ریسیں بھی چھوٹیں، تفریح کی جگہ بیوی کے رُخ انور کی زیارت ضروری ٹھہرے، تھیٹر کے کھیل کی عوض بچوں کا کھیل زیادہ پسند آئے، اور سینما کی چلتی پھرتی تصویروں کی جگہ گھر والی کے خرام ناز کا تماشا ہونے لگے۔ اسی لئے سب خاموش ہو رہے۔ منور کے خسر کے دل کو لگی تھی۔ انھوں نے پہلے اس کے کار پرداز

چچا کو بلا کر کہا، انھوں نے ڈرتے ڈرتے ذکر کیا، ڈانٹ دیئے گئے۔ گو بزرگ تھے لیکن ملازم بھی تھے، اپنی روٹیوں کا پاس کر گئے۔ کون پیٹ پر ٹھیکرے باندھ کے نکلنا پسند کرتا ہے؟ لگی ہوئی نوکری آج کل زندگی کے برابر ہے، کس کے سر پہ اجل کھیلتی ہے کہ وہ اصول کے لیئے ملازمت کو بازیچۂ اطفال بنائے۔ اسلیئے چچا نے زبان بند کر لی، اور منہ سی لیا، خود اس کے پاس خسر کا خط آیا! پہلے تو جواب ہی کی ضرورت نہ سمجھی گئی، جب بار بار تاکید کی گئی تو لکھ بھیجا کہ "مجھے منظور نہیں، آپ کہیں اور رشتہ کر لیں" دوست احباب کے مجمع میں یہ بھی بولا "مجھے اگر بلی پالنا ہوگی، تو میں یورپ کی کیوں نہ پالوں گا، گلے میں پھندا اگر ڈالنا ہی ہے، تو ریشمی کیوں نہ ہو، سوت کی موٹی رسی کا کیوں ہو؟ پھر دھیلے کی ہانڈی انسان لیتا ہے تو دیکھ بھال اور ٹھونک بجا کے، نہ کہ اتنا بڑا سودا اور وہ بھی مرحوم والدین کی مرحوم خواہش کی بنا پر، نہیں صاحب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دیدہ دانستہ آستین میں ناگن پالوں!"

خسر نے مہر کے دعوے کی دھمکی دی، اس نے لکھا کہ "میں اس کے لئے بھی تیار ہوں" سلمیٰ نے سن گن پالی، وہ غریب، بے زبان، خدا سے لو لگائے بیٹھی تھی منور کے کارنامے اس کے نظر یئے، دور دور تک مشہور تھے، وہ سب کچھ سن رہی تھی، مگر ہندوستانی تھی، شریف تھی۔ منور کے الفاظ میں "غیر مہذب" تھی اور عرفاً بن بیاہی تھی۔ اس کی زبان نہ کھل سکتی تھی، وہ اپنے منہ سے ہاں نہیں کچھ نہ کہہ سکتی تھی شرم نے پہرے بٹھا رکھے تھے، اور ہر دم پاسبانی کرتی تھی، مگر وہ پڑھی لکھی تھی، دین و مذہب سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عقد نے اسے منور کی بیوی بنا دیا ہے اور وہ اس کا سرتاج اور شوہر ہو چکا ہے، بیاہ محض ہندوستانی رسم کی پابندی

عرف عام کی پیروی ہے' ورنہ اس کی ضرورت ہے' اور نہ حاجت۔ اسی لئے جب اس نے گھر میں مہر اور طلاق کا چرچا سُنا تو وہ کئی روز تک پیچ و تاب کھایا کی، وہ اس رشتے کے قطع کرنے کی مخالف تھی، مگر اس اختلاف کا اعلان شرم کی وجہ سے ناممکن سا تھا۔ مگر ضرورت اور مجبوری سب کچھ کراتی ہے، ایک دن اپنی ایک سہیلی سے منہ پھوڑ کے وہ بول ہی اٹھی:۔

"بہن مجھے یہ مہر اور طلاق کا ذکر ایک آنکھ نہیں بھاتا، اب تو جس کے ساتھ عقد رکھا نکاح ہو چکا میں ان کی لونڈی بن چکی، وہ خواہ مجھے پوچھیں یا نہ پوچھیں، میں ان کے نام پر بیٹھی رہوں گی سینکڑوں رانڈیں ساری عمر یونہی بسر کر دیتی ہیں، پھر میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ تم کسی طرح اس بات کو ابا جان کے کانوں تک پہنچا دو کہ اگر طلاق کا پھر کسی نے نام لیا تو میں کچھ کھا کے سو رہوں گی، مجھ سے یہ رسوائی نہ سہی جائے گی۔"

منور کے خسر، بیٹی کا ایماء پا کے' خاموش ہو رہے' ان کے لئے یہ رشتہ عذاب جان تھا۔ داماد حد درجہ آزاد، بیٹی حد درجہ کی شریف، نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن۔ منور کے ساتھ شادی کیا تھی سانپ کے منہ کی چھچھوندر تھی، نہ نگلتے بنے نہ اُگلتے!

ڈاکٹر منور یونہی شوپنہار کے فلسفے پر گامزن انڈے ٹمن چاپ، پڈنگ اڑا رہے تھے کہ بلائے ناگہانی کی طرح مکھن ہی چیچک کے جراثیم کہیں سے آنکلے، اور صاحب کے ٹوسٹ کیا تھا نازک انسانی جسم میں پہنچ گئے۔ دوسرے ہی دن دانے ابھرے اور وہ بھی اس کثرت سے کہ جسم میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ سوسائٹی کے اراکین نے یہ سنتے ہی بنگلے کے سامنے والے بکس میں کارڈ چھوڑے اور اپنے اپنے گھروں میں ٹیکے لگوا لگوا کر بیٹھ رہے، انڈے برج، فلش، سب یک قلم موقوف ہو گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہی قرنطینہ کا حکم دیا۔ گھر

میں عورتیں نہ ہونے کے باعث کرائے پر نرسیں بلائی گئیں، بڑی بڑی فیسیں لے کے سپید سپید وردیاں ڈٹ کے تانگوں پر موٹروں پر لد کے صبح شام آنے لگیں۔ مگر روپیوں کا لالچ اور خدمت مرضا کی تعلیم، دلی خلوص اور سچی ہمدردی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ نرسیں وقت پر دوا دے سکتی تھیں، مگر مریض کی نگرانی نہ کر سکتی تھیں، ڈاکٹر کے احکام کی پابندی کر سکتی تھیں، مگر ان کا دل منور کے درد سے دکھتا نہ تھا، ان کو اس کے جسم کے چھونے سے احتراز تھا، انہیں اس کے مرض سے گھن آتی تھی! حق تو یہ ہے کہ ان کے دل کو نہیں لگی تھی۔ انکا سہاگ منور کے دم سے نہیں قائم تھا۔ البتہ جب سلمیٰ نے منور کی حالت سنی تو وہ بیتاب ہو گئی۔ حجاب و شرم کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، برق بیتاب کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی اور ماں کے قدموں میں جا کے گر پڑی، دونوں خوب لپٹ کے روئیں، بیٹی نے رکتے رکتے ایک ایسی بات کی خواہش کی جو آج تک ہندوستان میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس پر مچلی تھی کہ وہ بن بیاہی اپنے شوہر کے پاس اس کی خدمت کرنے جائے گی، ماں نے سمجھایا، گھڑکا، ڈانٹا، مگر اس نے ایک سماعت نہ کی۔ وہ کہتی بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لپک، بن دیکھے نہ رہوں گی، رنڈاپا قسمت میں ہے، رسوائی مقدر میں، مگر آخری خدمت کی حسرت دل میں کانٹے کی طرح ہمیشہ کھٹکے گی، دنیا جو چاہے کہے، اب میں نہ مانوں گی، جاؤں گی ضرور۔ آخر مجھے بھی ایک دن خدا اور رسول کو منہ دکھانا ہے یا نہیں؟ میں انہیں کیا جواب دونگی؟" سوت کی رسی پتھر پر خط ڈال دیتی ہے، ماں کا دل تھا موم کا، بیٹی کی منتوں سے کیوں نہ پسیجتا؟ شوہر کو باہر سے بلا بھیجا۔ اُن سے بیٹی کی خواہش کا ذکر کیا، پہلے تو وہ ہندوستانی تربیت کے ماتحت خوب خوب بگڑے بیٹھے، پیٹے،

مگر جب یہ معلوم ہو گیا کہ بیٹی کی بالک ہٹ میں بیوی کی تریا ہٹ بھی شامل ہوتی جاتی ہے، اور بغیر اجازت دیئے بن نہ پڑے گی تو سوچ کے بولے :۔

"اچھا وہ جائے، مگر اس شرط پر کہ تم خود اسے اپنے ساتھ لے کے جاؤ"

بیوی نے کہا "کیا تم۔ مجھے ایسی سٹرن سمجھے تھے کہ میں اسے تنہا جانے دوں گی؟ میاں منوّر بیمار ہوں یا اچھے، سلمیٰ جائے گی انہیں کے گھر، اپنی سسرال، وہ بھی پہلی مرتبہ پھر اس گھر میں نہ کوئی بڑی بوڑھی ہے، اور نہ سنتی ہوں کہ کوئی عورت فات، خدا جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے، وہ بھلا تنہا ایسے مکان میں کیسے جا سکتی ہے"

میاں نے ذرا نرم ہو کے کہا "ہاں میرا یہی مطلب تھا کہ اسے تنہا وہاں نہ جانا چاہیئے" اور باہر چلے گئے۔

ایک ہی شہر کا تو معاملہ تھا، ماں بیٹی دونوں گاڑی پر سوار ہو کے، دو ماما ئیں ساتھ لے، اُسی وقت منور کے ہاں پہنچیں، گھر میں کوئی عورت تو تھی ہی نہیں، ان دو پردہ دار عورتوں کے پہنچ جانے سے اچھی خاصی چہل پہل ہو گئی۔ سلمیٰ کی ماں تو قیام وطعام کے انتظام میں مصروف ہوئیں، اور سلمیٰ ادھر شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی۔

رونمائی کی رسم یہیں نرس کے ذریعے انجام پائی، مگر یہ عجیب طرح کی بات تھی کہ اسوقت دلھن صورت دیکھنے آئی تھی، اور دولھا آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ بلکہ اسے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔

ڈاکٹر منور ایک نواڑ کے پلنگ پر لیٹا کراہ رہا تھا قریب قریب سارا جسم عریاں تھا،

ایک ململ کا دوپٹہ جسم پر ڈال دیا گیا تھا۔ کمرہ گندھک سے بسا ہوا تھا، باوجود حد درجہ احتیاط کے دو چار مکھیاں پلنگ کے قریب بھن بھن کرتی اڑ رہی تھیں مریض کی صورت اس قدر بھیانک تھی کہ دیکھنے سے ڈر معلوم ہوتا تھا، انگریزی بال سر کے دانوں کی وجہ سے مونڈ دیئے گئے تھے کرزنی چہرے پر ڈاڑھی اور مونچھ کے بال ناہموار طور پر نکلے ہوئے تھے۔ سارے جسم پر ورم تھا ناک کا بانسا سوج گیا تھا، پلکیں پکی ہوئی تھیں، ہاتھ پاؤں، ہر ہر عضو، ہر ہر بن مو، دانوں اور زخموں سے ڈھکا ہوا تھا۔

سلمیٰ نے پہلی بار شوہر کو اس ہیئت میں دیکھا، اس نے جو خیالی تصویر اپنے دل میں بنا رکھی تھی۔ یا جو حلیہ اس سے دوسروں نے بیان کیا تھا، اس میں اور اس زخموں سے پھولے سوجے متورم مجسمے میں اتنا تفاوت تھا کہ چند منٹ تک اس کا یہی جی چاہا کہ وہ چیخ مار کر بھاگ جائے، مگر صدہا پشت کی تربیت کا خون میں جو اثر تھا، اور بچپن سے شوہر کی اطاعت اور خدمت کی جو تعلیم دی گئی تھی، وہ اب کام آئی۔ وہ ایکبارہ کانپی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلیں، اور سمٹیں اور اس کی مژہ پر آنسو جھلک آئے، پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی شوہر کے پلنگ کی طرف بڑھی، نرس نے روکا، سلمیٰ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، اور پلنگ سے مل کے فرش پر بیٹھ کے شوہر کا منہ تکنے لگی، گویا اس بگڑی ہوئی صورت میں خیالی تصویر کے آثار ڈھونڈھ رہی تھی! پھر دفعتاً چونک پڑی، دستی پنکھا اٹھا لیا، شوہر کے جسم سے مکھی جھلتی جاتی تھی، اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتی جاتی تھی، اور متورم کے خشک لبوں پر برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھتی جاتی تھی۔

نرس بڑے غور سے اس سماں کو دیکھ رہی تھی، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منور کی زندگی اب خطرے سے نکل گئی، اس لئے کہ اب مرض یا کیلا تھا اور اسکی مقابل ایک کی جگہ دو دو تھیں! وہ اطمینان سے مسکرائی، اس نے "ایڈگر ویلس" کا ایک ناول اٹھالیا، اور مریض و مرض سب کو بھول کر وہ اس میں غرق ہو گئی! تیمارداری کا بوجھ اب دوسرے کاندھوں پر تھا، وہ سبکدوش تھی

سلمٰی کے آنے کے دوسرے دن سے مرض کا زور گھٹنے لگا، آہستہ آہستہ زخموں میں کھرنڈ پڑے، اور مرض، منور کی آنکھوں سے نور ہدیتہً لے کے اور چہرے اور جسم پر بہت سے داغ اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ کے چلا گیا۔ ہوش و حواس درست ہوتے ہی ڈاکٹر منور نے اس حس کی کمی کو محسوس کیا، مزاج میں توکل اور صبر نہ ہونے کی وجہ سے اس نے آنکھوں کے جانے کا بڑا ماتم کیا۔ کئی وقت غذا نہیں کی، بات بات پر ہائے آنکھیں، ہائے میری آنکھیں" کہہ کہے چیخ چیخ کے رو دیا سلمٰی کئی دن تک زبان بند کئے رہی، مگر جب اس نے دیکھا کہ بے صبری حد سے زیادہ بڑھی جا رہی ہے تو تسکین دینے والے لہجے میں بولی:-

"خدا کو یونہی منظور تھا۔ اب اتنا رنج فضول ہے۔"

منور نے آج پہلی دفعہ ایک نئی دلکش اور سُریلی آواز سُنی، پوچھا "کون؟"

سلمٰی کے حلق میں کانٹے پڑ گئے، اس نے کئی مرتبہ زبان خشک ہونٹوں پر پھیری، رُک رُک کے بولی: "آپ کی لونڈی...... سلمٰی!"

منور نے تعجب سے پوچھا: "تم کیوں کر یہاں آئیں؟"

سلمیٰ نے آہستہ سے کہا "اماں کے ساتھ..... آپ کی خدمت کرنے!"

منور کی بے نور آنکھیں اس جواب پر کھل گئیں۔ اللہ اکبر! عورت اس قدر خطاپوش وعطاپاش ہے، وفا کا مجسمہ! محبت کی پتلی! ایثار کی جان! شرما کے بولا "میں نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے!"

جواب ملا "آپ مالک ہیں، آپ کو ہر طرح کا اختیار ہے"

منور کو اس جواب نے مدہوش کر دیا، اس نے اندھوں کی طرح ٹٹول کے سلمیٰ کا نازک ہاتھ اپنے سخت ہاتھوں میں لے لیا، مگر اپنے مرض کے ساری ہونے کا خیال آتے ہی گھبرا کے چھوڑ دیا۔ سلمیٰ نے شرماتے شرماتے خود ہی ہاتھ بڑھایا اور وہ منور کی جھائیں کی سی کھر کھری ہتھیلی اپنے کنول سے نرم ہاتھوں سے سہلانے لگی۔ منور نے کہا:۔

"ہائے تمہیں میں اب دیکھ نہیں سکتا!"

نہایت ہی شیریں لب ولہجہ میں جواب ملا "نہیں اب بھی آپ دیکھ سکتے ہیں"

منور نے پوچھا "کیسے؟"

سلمیٰ نے کہا "دل کی آنکھوں سے!"

منور کے ہونٹ کانپنے لگے، پیشانی پر خجالت کا پسینہ جھلک آیا، تھوڑی دیر بعد وہ بولا "نہیں! نہیں سلمیٰ، تم کو مجھ سے طلاق لے لینا چاہیئے، میں پہلے روحانی طور پر اندھا تھا، اب جسمانی حیثیت سے بھی ہوں، میں تمہیں اپنی لکڑی نہ بناؤں گا"

سلمیٰ نے بڑی محبت سے کہا "آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں، مجھے رنج ہوتا ہے۔

بیوی شوہر سے علیحدہ نہیں ہوسکتی! دونوں ایک دوسرے کے سہارے ......"

منور نے قطع کلام کرکے کہا "مگر میری آنکھیں"

سلمیٰ نے بڑی محبت سے کہا "آپ اپنی آنکھوں کا کیوں بار بار ذکر فرماتے ہیں، پہلے بھی وہ نہیں اور اب بھی ہیں"

منور خاموش ہوگیا، مگر سلمیٰ کے ایثار اور قربانی نے انہیں دبے ہوئے جذبات شرافت کو اُبھار دیا تھا، خودی کے مد میں جو غیرت وحمیت کے پہاڑ ڈوب گئے تھے وہ اب خودی کے جزر میں سطح پر آگئے۔ اس نے پھر گھبرا کر کہا "نہیں نہیں یہ زندگی بھر کا ساتھ ہے، میری سی سیرت وصورت کے آدمی سے نباہ محال ہے"

سلمیٰ مسکرائی، اور عجیب طرح کی متانت اور خودداری سے بولی "شوہر کی سیرت، بیوی کے اختیار میں ہے۔ وہ جس رنگ میں چاہے ڈھال لے، وہ ماں کی طرح اسے سنوار اور بگاڑ سکتی ہے، میں نے تو اب آپ کی سیرت اپنے دل کے مطابق بنالی ہے"

منور گھبرا کے سلمیٰ کا منہ تکنے لگا، گویا وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کے وہ کسی طرح اس حجاب کو درمیان سے اٹھا دے جو اس کی آنکھوں کے سامنے حائل تھا جب وہ اس کوشش میں ناکامیاب رہا تو صد درجہ شکستہ آواز میں بولا "یہ بھی سہی لیکن صورت! ہائے وہ تو اب کسی قابل نہ رہی" سلمیٰ نے عجیب دلربایانہ انداز سے دستِ حنائی بڑھا کے منور کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اسے آہستگی سے بلند کرکے بولی "اب تو وہ بھی میری آنکھوں سے دیکھی جائے گی"

منور کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کے رخساروں پر آ گئے، سلمٰی نے جھک کے انھیں پاک کر دیا۔ گویا شبنم کے موتی تھے کہ گلوں کی نازک پنکھڑیوں سے سمیٹ لئے گئے۔

منور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "واللہ تم عورت نہیں فرشتہ ہو!"

سلمٰی کا چہرا خوشی سے چمک اٹھا، معلوم ہوتا تھا افق مشرق سے ابھی ابھی آفتاب نکلا ہے وہ فخریہ لہجے میں بولی "نہیں، نہیں، میں ایسے مرتبے والی نہیں، میں صرف عورت ہوں، وہ بھی کوئی اور نہیں آپ کی بیوی، آپ کی باندی، آپ کی لونڈی!"

منور روتے میں مسکرا کے بولا "تو خدا سب کو ایسی ہی دے!........"

اور دو پھٹے ہوئے دل اس طرح مل گئے۔ جیسے الہ آباد کے قریب گنگا جمنا....

ہاتھوں میں ہاتھ لئے خلوص و محبت کے عہد دلوں میں، اور خوش زندگی بسر کرنے کی تدبیریں زبانوں پر! ⁂

نئی ہمسائی

نئی ہمسائی جب سے بغل والے مکان میں تشریف لائیں میں نے اپنے اور ان کے مکان کی درمیانی کھڑکی بند کرادی۔ میں یہ نہیں پسند کرتا تھا کہ میری بیوی ان کی طرح کی عورتوں سے میل جول بڑھائیں۔ میں خود ان کے "میاں" سے ملنے میں زیادہ قباحت نہیں سمجھتا تھا۔ مردوں کی علیک سلیک" سینکڑوں قسم کے آدمیوں سے ہوتی ہے۔ مرد کپڑوں میں لپیٹ کر نہیں رکھا جاسکتا۔ چاقو کی طرح رگڑ سے اس میں تیزی بڑھتی ہے۔ وہ ادنیٰ کپڑا ہے جسے دھوپ نہ دکھائیے تو کیڑے چاٹ جائیں۔ مگر عورت پھول ہے۔ "نازک، لطیف، خوشبودار، جہاں ہمسایہ خراب ملا۔ بوباس میں فرق آیا۔ جہاں ہمنشیں برے ہوئے اور رنگ روپ بدل گیا!

پھر میں اشرف صاحب سے ایک زمانے سے واقف تھا۔ وہ ایک رنگیلے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ ہر سال "تقویم پارینہ" علیحدہ کر دیتے اور نئی جنتری سے دل بھلاتے۔ اب کے نظرِ انتخاب بی ہمسائی پر پڑی اور وہ بغل والے مکان میں لاکر اتار دی گئیں۔ اشرف صاحب کا خود گھر موجود تھا۔ بزرگوں میں کوئی مرد اور عزیزوں میں کوئی عورت نہ تھی۔ مگر اپنا مکان چھوڑ کے یہ عنایت میرے ہی ہمسایے پر کیوں کی گئی، اس کی حقیقت سے نہ میں واقف تھا اور نہ میری بیوی۔ وہ اشرف صاحب سے مجھ سے بھی زیادہ خفا تھیں۔ وہ کہتیں "اگر انہوں نے یہ مکان نہ لیا ہوتا۔ تو کوئی بھلا مانس اس میں آکے اترتا اور مجھ نگوڑی کا ہمسائی سے دل بہلتا۔ مگر ان نئی بی صاحبہ کو تو رات دن سوائے گانے بجانے کے کوئی کام ہی نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے ڈھاریوں اور کسبیوں کا گھر ہے!"

ان کا غصہ بجا تھا۔ اس لئے کہ گھر میں جتنے سمجھدار تھے وہ سب نماز کے عادی تھے ہم میاں بیوی کی دیکھا دیکھی سہی، مگر مامائیں بھی نماز پڑھتی تھیں اور ملازم بھی۔ بچوں میں صرف ایک منیر تھا۔ جو پیار سے "بھیا" پکارا جاتا تھا۔ اس کی عمر اس وقت مشکل سے چار برس کی ہوگی۔ بیگم سوائے بھیا کے کھلانے اور ماماؤں کو حدیث قرآن پڑھ کے سنانے کے اور کوئی کام نہ کرتیں۔ ان کے ہاں مذہبیت کا دفور تھا۔ اب ہمسایہ ملا اس طرح کا، بالکل ہی ان کا ضد! ایک طرف تو تہلیل و تسبیح کا دَور اور دوسری جانب سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی کی رٹ!

پھر مفتیوں کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے ہم قدامت پسند بھی تھے۔ ہماری معاشرت وہی تھی جس پہ ہمارے بزرگ کاربند رہ چکے تھے۔ ہم لوگوں سے عام طور پر ملنا جلنا پسند نہ

کرتے تھے اور ہماری عورتیں ان گھروں میں نہیں آنی جاتی تھیں جن پر جدید تعلیم کا رنگ چڑھ چکا تھا اور جہاں دنیاوی ترقی کی غرض سے مغرب پرستی کی شدت تھی۔

اب تک جو بی بی پڑوس میں رہتی تھیں، ان کے میاں کسی دوکان پر کام کرتے تھے وہ سیدھے سادھے نیک مسلمان تھے۔ دنیا کے جھگڑوں سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا، مقررہ وقت پر اپنے کام سے جاتے۔ مقررہ وقت پر واپس آتے۔ اپنے بال بچوں کے ساتھ جو دال دلیا میسر آتا خوش خوش کھاتے اور خدا کا شکر بجا لاتے۔ خود بی ہمسائی کی یہ حالت تھی کہ گھر کے کام کاج سے جہاں فرصت پاتیں ٹوپیاں لے کر بیٹھ جاتیں ایسے ایسے گل بوٹے کاڑھتیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے، دس بارہ آنے کی روزانہ، میاں کے علاوہ، مزدوری کر لیتی تھیں ساس پر ملنسار ایسی کہ دن میں دو مرتبہ محض بھیا کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ہمارے ہاں آیا کرتیں جب ہمارے ہاں کوئی کام ہوتا تو اس میں بیگم کا اس طرح ہاتھ بٹاتیں کہ محسوس ہوتا کہ کوئی غیر نہیں بلکہ اپنی قریب ترین عزیز ہیں۔ بیگم انھیں "بہن" پکارتی تھیں اور ننھا منیر اپنی توتلی زبان میں انھیں "کھالا جان" کہنا اچھی طرح سیکھ گیا تھا۔

وہ جب سے چلی گئی تھیں ہم لوگوں کو خاصی تکلیف تھی۔ بچہ بھی کڑھتا تھا اور بیگم بھی اداس رہتی تھیں۔ تسکین صرف اتنی تھی کہ ممکن ہے نئی ہمسائی ویسی ہی یا ان سے بہتر مل جائیں اور اب آئیں یہ ذات شریف! معاملہ بالکل ہی برعکس ہو گیا۔ وہ تو کہیئے کہ بڑی خیریت ہوئی کہ میں نے اشرف صاحب کو اسوقت دیکھ لیا جب کہ وہ مکان کا معائنہ کرنے آئے تھے، ان کی چھپی چھپی باتوں سے میں تاڑ گیا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ میں نے اسلئے نئی ہمسائی

کے ورود کے پہلے ہی کھڑکی میں قفل ڈلوا دیا تھا۔ اگر کہیں بے تکلفی بڑھنے کے بعد بیگم کو معلوم ہوتا کہ نئی ہمسائی کس قماش کی عورت ہیں تو حد درجہ بے لطفی ہوتی!

جب نئی ہمسائی آئیں تو انھوں نے ایک دن کھڑکی پر آکر خوب کھٹکھٹایا۔ ماما سے کہلا دیا گیا کہ "میاں کا حکم نہیں کہ کھڑکی کھولی جائے"۔ انھوں نے کہا "اچھا بیگم صاحبہ سے سلام کہو اور کہو ذری کھڑکی تک کھڑی ہو جائیں۔ ہم تو اُن سے ملنے آتے ہیں اور وہ اپنی جگہ سے ہلیں تک نہیں"۔

بیگم نے صاف صاف کہلا بھیجا کہ "مجھے نہ ان سے ملنے کی فرصت ہے اور نہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں"۔ اس تلخ جواب پر وہ بہت آزردہ ہوئیں اور یہ کہتی ہوئی چلی گئیں کہ "اچھا تو ان سے کہہ دینا بی بی اگر آپ نہیں ملنا چاہتیں تو یہاں کس کی جوتی کو غرض ہے نہ ہم ان کے بسائے ہوتے ہیں اور نہ ہم ان کا دیا کھاتے ہیں۔ ہونھ کیا مزاج پایا ہے.... اے ہم نے کہا پڑوس میں آکے ٹکے ہیں، چلو اپنی ہمسائی سے مل لیں مگر معلوم ہوا وہ تو بڑی نک چڑھی ہیں۔ اے ہو نگی خاص رسول اللہ کے گھرانے کی۔ ہماری پاپوش کو غرض!"

اسی درمیان میں مجھ سے اور اشرف صاحب سے ایک دن سامنا ہو گیا۔ صاحب سلامت کے بعد انھوں نے جس قدر تپاک برتا، میں اتنی ہی رکھائی سے پیش آیا۔ بالآخر وہ گھبرا کے بولے "کیوں مشہود صاحب، مجھ سے کیا قصور ہوا ہے جو آپ خاص طور سے خفا معلوم ہوتے ہیں"۔

میں فطرتاً سیدھا آدمی ہوں اور گفتگو میں صفائی زیادہ پسند ہے، مجھے طعن و تشنیع و طنز

سے کوئی لگاؤ نہیں لیکن اشرف صاحب کی حرکتوں سے اس قدر جلا ہوا تھا کہ اس دن میں نے ان سے کچھ اسی طرح کی باتیں کیں۔ ان کے جواب میں میں نے کہا "آپ اور قصور واللہ آپ کیا فرماتے ہیں اجی حضرت آپ نے تو مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آپ کے صدقے میں مجھے سرو ہمسایہ اور حسن رہگذر ے دونوں میسر ہیں بھلا میں آپ سے خفا ہو سکتا ہوں۔ میری اور یہ مجال"

وہ مسکرا کر بولے "اچھا تو یہ بات ہے۔ مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اسے آپ کے ہمسائے میں محض اسلیئے لایا ہوں کہ میں اسے ایک بیسوا کی جگہ ایک نیک اور پارسا عورت بنانا چاہتا ہوں"

میں نے کہا "مجھے آپ کی ذات سے یہی امید ہے مگر میری یہ نہیں سمجھ میں آیا کہ میرے ہمسائے میں ایسی کونسی خصوصیت ہے؟"

وہ بولے "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس حسن۔ اس گلے اور اس مزاج کی زنڈی آج تک نہیں دیکھی میں نے اسی لئے اس سے یہ خواہش کی کہ وہ مجھ سے نکاح کرلے مگر وہ آزادی کی زندگی کی اس قدر عادی ہو گئی ہے اور گھریلو زندگی سے اس قدر گھبراتی ہے کہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے اسے آپ کے ہمسائے میں لایا ہوں کہ وہ آپ کے گھر کی زندگی اور آپ میاں بیوی کی محبت و آشتی کو دیکھ میری بات مان لے"

میں نے کہا "تو اتنا بڑا شہر ہے، آپ کو سینکڑوں اس طرح کے میاں بیوی مل جاتے۔ یہ مجھ ہی پر کرم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولے۔" آپ لوگ مولویوں کے گھرانے سے ہیں نا، آپ کا اثر دوسروں سے زیادہ جلد اور گہرا پڑیگا"

مَیں نے اپنی فطری صاف گوئی سے کام لے کے ان سے کہہ دیا" تو حضرت اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی حالت میں اپنی بیوی کو آپ کی زندگی سے ملنے دونگا تو آپ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اگر آپ میرے ہمسایہ سے نہ اُٹھ جائیں گے تو میں خود اس مکان کو چھوڑ دونگا" میں نے اس کے بعد ان کی کوئی بات نہ سُنی اور جھلایا ہوا گھر واپس چلا آیا۔

اس دن سے میں نے محسوس کیا کہ شور و ہنگامے میں بہت کمی ہو گئی۔ گانا ہوتا ضرور تھا مگر مقررہ اوقات پر اور ٹھٹھے اب بھی لگتے تھے مگر اس طرح کی آوازوں میں جو ہمارے کاموں میں مخل نہ ہوں۔ البتہ بیگم سے یہ معلوم ہوا کہ ہر روز "بھیا" شام کے وقت گود سے اتر کر لپٹے "صندلی پاؤں" سے کھڑکی تک ضرور جاتا اور لاکھ منع کیا جاتا مگر وہ کھڑکی کو خوب پیٹ پیٹ کے "ہمچائی ہمچائی" کہہ کے ضرور پکارتا۔ وہ بھی کھڑکی پر آتیں اور اُسے غالب کی مشہور غزل آشیاں کیوں ہو۔ آسماں کیوں ہو" گا کے سناتیں اور ذیل کا شعر بار بار دہراتیں

وفا کیسی۔ کہاں کا عشق۔ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

بیگم یہ بھی کہتی تھیں کہ آواز میں اس بلا کی کشش ہے کہ بیساختہ دل کھنچتا ہے اور ان کا بھی یہی جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی کھڑکی کے پاس جا کے کھڑی ہو جائیں۔ بلکہ کھڑکی کھولکر گانے والے کو کلیجہ سے لگا لیں۔ میں نے طے کیا کہ اس نئی چھیڑ کا فوری تدارک ضروری ہے

اس لئے میں نے اشرف صاحب کو اسی وقت خط لکھا

"مکرمی تسلیم۔ بی صاحبہ سے میری جانب سے عرض کر دیجئے کہ میرے گھر کے لوگوں کو ہر روز کھڑکی پر آکے پریشان نہ کریں۔ میں ممنون ہوں گا" انھوں نے جواب میں لکھا "وہ کہتی ہیں انھیں آپ کے بچے سے محبت ہے۔ دن میں تھوڑی دیر کے لئے وہ اُسے بند کھڑکی کے دراڑوں سے جھانک لیتی ہیں۔ اگر آپ اس بچے کو ہر روز میرے ہاں آدھ گھنٹے کے لئے بھیج دیا کریں تو وہ وعدہ کرتی ہیں کہ وہ آج سے کھڑکی پر ہرگز نہ جائیں گی" مجھے ان کی اس شرط پر حد سے زیادہ غصہ آیا میں نے جھلا کے لکھ بھیجا "میرا بچہ نہ اس طرح کے ناشائستہ گھروں میں جا سکتا ہے اور نہ اس طرح کی ناپاک گودوں میں!"

اسی دن کھڑکی میں دوسری جانب سے بھی قفل پڑ گیا اور دراڑوں میں کاغذ کے ٹکڑے چپکا دیئے گئے، نہ کھڑکی کے پاس پھر گانا ہوا اور نہ بھیا کے چیخنے اور پکارنے پر کسی نے اعتنا کی مجھ سے اور اشرف صاحب سے بھی صاحب سلامت بند ہوگئی۔ غرض بائیکاٹ پورے طور پر ہوگیا۔

مگر بھیا ہر روز کھڑکی پر جانے کے لئے مچلتا ضرور تھا اور روکے جانے پر فیل لاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ ماندہ سا بھی رہنے لگا۔ لیکن میں نے کسی امر کی پروا نہیں کی۔ میں اپنے ناسمجھ معصوم بچے کو گانے بجانے کا عادی نہیں بنا سکتا تھا اور نہ میں اس کی ضد پر اسے ہمسائی کی سی عورت کے پاس بھیج سکتا تھا۔ میں نے اس لئے یہ طے کر لیا کہ مہینہ ختم ہوتے ہی اس مکان اور اس ہمسائے کو خود ہی چھوڑ دوں گا۔

اس فیصلے کے دو ہی چار دن بعد مجھے دفعتہً ایک سرکاری کام سے دیہات جانا پڑا۔

گو تقریباً تیس میل کا سفر تھا مگر میری فٹن کا گھوڑا کافی تیز اور مضبوط تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں شام تک واپس چلا آؤں گا۔ بھیا کی طبیعت حسب معمول سُست تھی۔ میں نے کوئی وسوسہ دل میں نہ آنے دیا اور اطمینان سے اپنا فرض ادا کرنے چلا گیا۔ وہاں قصبہ میں خلاف معمول دیر ہو گئی۔ اور رات کے آٹھ بج گئے۔ شہر سے پندرہ میل کا فاصلہ تھا اور نصف کے قریب سڑک خام تھی، مگر بھیا کی ماندگی کا خیال، جواب تک فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بالکل ذہن میں نہ تھا، آتے ہی دل گھبرا اٹھا۔ اور گو اہلِ قریہ مجھے روکتے رہے مگر میں اسی وقت روانہ ہو گیا۔ ابھی گاؤں سے مشکل سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا ہونگا کہ دفعتہً شمال و مشرق کی جانب سے گھٹا اُٹھی۔ سائیس نے گھبرا کر کہا۔ "حضور پانی آن والا ہے۔ گاؤں پلٹ چلیں۔" میں نے گھوڑے کو تیز کر کے کہا۔ "نہیں جی برسے گا نہیں۔ پھر ہم لوگ ڈیڑھ گھنٹے میں تو گھر پہنچ جائیں گے۔"

مجھے خیال تھا کہ اس گھٹا کی بھی وہی حالت ہوگی جو اس سال لکھنؤ کے لئے روایت ہو گئی تھی۔ تین تین چار چار دن متواتر ابر آتا تھا مگر بلا تامل سیدھا پچھم بھاگتا چلا جاتا تھا۔ گویا منزلِ مقصود کہیں مغرب میں تھی اور لکھنؤ محض گذرگاہ تھا۔ لیکن میرے اس یقین کو چند ہی منٹ بعد پانی کی چادر نے پاش پاش کر دیا۔ پانی برسا اور اس طرح سے برسا کہ جسم پر چوٹ لگتی تھی معلوم ہوتا تھا جیسے کسی آسمانی دریا میں سیلاب آگیا ہے اور اس نے سارے بند توڑ ڈالے ہیں۔ بجلی علیحدہ چمکتی تھی اور گرج اس آفت کی تھی کہ الامان والحفیظ۔

اب آپ ہی خیال فرمایئے کہ رات کا وقت، کچّی سڑک بھڑکنے والا گھوڑا سنسان میدان

اور پانی کا یہ شور۔ مزید مصیبت یہ آئی کہ گھوڑے کے جھٹکوں اور ہوا کے جھونکوں نے فٹن کی لالٹینیں بھی بجھا دیں۔ بس کچھ نہ پوچھئے کہ راستہ کیونکر طے ہوا۔ اور جان کیونکر بچی، موت خود ہی حفاظت کر رہی تھی۔ ورنہ مرجانا یقینی تھا۔

خیر خدا خدا کرکے پختہ سڑک پر پہنچے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر بیڑی سگریٹ بیچنے والوں نے کچھ پھونس کے چھپر لب راہ ڈال رکھے تھے۔ جب ہم لوگ ان کے قریب پہنچے، تو سائیس نے سردی اور خوف سے کانپتے ہوئے کہا، "حضور! یہاں دم لے لیجئے، جرا پانی رُکے تو پھر چلیں" میرا بھی سردی سے بُرا حال تھا۔ دوسرے گھوڑے کی منہ زوریوں سے دونوں ہاتھ شل ہوگئے تھے۔ میں نے اب کے سائیس کی رائے پر عمل کیا اور فٹن روک کے اُتر پڑا۔ اور ایک چھپر کے نیچے، جہاں پانچ سات دیہاتی آگ جلائے بیٹھے تھے، میں بھی جا کے کھڑا ہو گیا۔ سائیس بھی گھوڑے کو ایک پاس ہی کے درخت میں اٹکا کے جلدی سے بھاگ آیا۔ دیہاتی میرے متعلق سائیس سے یہ معلوم کر کے کہ میں سرکاری افسر ہوں تھوڑا بہت سہم گئے اور سمٹ کے مجھ سے تھوڑی دور پر بیٹھ گئے، دوکاندار نے ایک چھوٹی سی تپائی لا کے مجھے بیٹھنے کے لئے دی اور آگ کو لکڑیاں بڑھا کر تیز کر دیا۔ میں اپنا کوٹ اتار کر اسی پر سکھانے لگا۔

پانی کی شدت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی، یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ دیہاتیوں میں کئی ایک وہیں گٹھڑی بن کے پڑ رہے اور ان کے خراٹوں کی آوازیں پانی کی آواز میں مل کے اسے اور بھیانک بنانے لگیں۔ دوکاندار بھی اُونگھ رہا تھا۔ بھوک اور نیند سے میری خود بُری حالت تھی۔ مگر پانی کی وجہ سے سب مجبور تھے، نہ کسی طرح کھلتا تھا اور نہ رکتا تھا۔ بالآخر

ایک بجے کے بعد کچھ کم ہوا۔ میں نے سائیس سے کہا "بھئی گاڑی کی لالٹینیں جلاؤ اب ہم چلیں گے" غرض ہم لوگ پھر بھیگتے ہوئے گھر چلے۔ گھوڑے نے بھی اب کی تیزی نہیں کی، بظاہر وہ بھی تھک گیا تھا یا نیند کی غنودگی میں تھا۔ بہر نوع ہم نے ہلکی دلکی کی رفتار سے بقیہ راستہ طے کیا اور کوئی تین بجے صبح کو گھر پہنچے۔

خیال تھا کہ وہاں سب خراٹے لے رہے ہونگے اور دروازہ کھلوانے کے لئے کافی چیخنا پڑیگا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مردانے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے میں جا کے دیکھا تو اشرف صاحب بیٹھے ہوئے ایک ناول پڑھ رہے ہیں۔ میں اپنے گھر میں انھیں اس طرح دیکھ کے حد درجہ گھبرا گیا۔ میں نے ان سے پوچھا "کیوں آپ اس وقت یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟" انھوں نے کہا "ہاں سب خیریت ہے آپ اندر جا کے فوراً کپڑے بدل ڈالئے۔"

میں بھی گھبرایا ہوا زنانخانے میں چلا گیا۔ وہاں جا کے دیکھا تو سارے گھر کی روشنیاں جل رہی ہیں، بیگم اپنے پلنگ پر لیٹی ہیں۔ ماما ظہورن پاؤں سہلا رہی ہیں اور بھیا کو ایک بیس برس کی حسین دوشیزہ گود میں لئے کلیجے سے لگائے بیٹھی ہے۔ میں ایک اجنبی عورت کو اپنے گھر میں بے نقاب دیکھ کے پہلے تو جھجکا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اس کی ساری توجہ بچہ کی طرف مبذول ہے، تو میں استعجاب اور گھبراہٹ کا بری طرح شکار ہو کر بیگم کے پلنگ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی گھبرا کے اٹھ بیٹھی تھیں، میں نے ان سے پوچھا "کیوں خیریت تو ہے؟" میرے اس معمولی سے سوال پر وہ "بھیا" کہہ کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ماما نے کہنا شروع کیا۔ "نا بی بی نا! آج شام سے آپ رو رو کے بیفضول کو اپنے کو ہلکان کر رہی ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ بچہ اچھا ہے۔ دل کو سنبھالئے آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ بیگم کے منہ سے اس وقت پورا واقعہ سن لینا محال ہے اس لئے ماما ظہورن سے کہا۔ "تم ہی بتاؤ کہ ہوا کیا۔ کیا بھیا بیمار ہو گیا تھا؟ کیا بات ہوئی آخر؟" اس نے کہا۔ "اے حضور کوئی بات نہیں۔ بی بی ابھی ماشاء اللہ خود ہی بچّا ہیں، اسی لئے ذرا سی بات سے گھبرا اُٹھتی ہیں۔ بھیا کی طبیعت ماندی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ ڈاکٹر کو بلواؤ، وہ موا امّن گیا تو ڈاکٹر نہ ملے۔ وہ کہیں نکل کھڑے ہوئے تھے اپنی پھیری پر۔ میں ابھی باہر ہی تھی کہ لڑکے کے چیخنے کی آواز سنائی دی، اب جو آکے دیکھتی ہوں تو لڑکا تو خیر لڑ کا ہی ہے۔ بیگم صاحبہ بھی بچپنا کر رہی ہیں۔ بھیا مچلا تھا کہ ہم کھڑکی ہی پر جاکے دم لیں گے، اور یہ اڑی تھیں کہ اپنا اور تیرا خون ایک کر دوں گی، مگر کھڑکی پر نہ جانے دوں گی۔ بچّا زمین پر لوٹ رہا تھا اور یہ اسے گھڑک رہی تھیں۔ جب وہ کسی طرح نہ مانا تو انھوں نے حضور اس کو دھوئیں دھوئیں پیٹ ڈالا۔"

میں نے دیکھا کہ میرے ہی چہرے پر آثار غم و غصہ نہ تھے بلکہ اجنبی دوشیزہ نے بھی ایک بار بیگم کو بہت ہی غصے سے دیکھا اور پھر گردن نہوڑالی۔ بیگم نے دیکھا کہ ظہورن بچے کی صفائی میں ان کے سر سارا الزام منڈھے دیتی ہے۔ تو جھڑک کر بولیں "تمھیں بات کا بتنگڑ بنانا خوب ہی آتا ہے۔ میں نے تو اسے ایک ہلکا سا طمانچہ مارا اور تم کہتی ہو کہ میں نے اسے پیٹ کے رکھدیا۔ بالشت بھر کا تو لونڈا ہے، لیکن ایسے ایسے فیل لاتا ہے اور ایسی ایسی

ضدیں کرتا ہے کہ جان عذاب ہو گئی ہے! ......"

ظہورن نے بات کاٹی "ہاں تو بی بی اب روتی کیوں ہو؟ اب جب اس کے دشمنوں کا یہ حال ہے تو دونوں آنکھوں سے گنگا جمنا کیوں بہ رہی ہیں؟"

میں نے دیکھا ان دونوں میں لڑائی چھڑی اور ظہورن نے دایہ ہونے کی حیثیت سے ماں کی زیادتیاں گنوانا شروع کیں۔ میں نے ڈانٹ کے کہا "اچھا ظہورن تم خاموش رہو، ہاں جی بیگم۔ خدا کے لیے بیان کرو کہ کیا ہوا؟"

انھوں نے کہا "اے ہوا کیا۔ میں کیا جانتی تھی کہ آج یہ کھڑکی پر جانے کے لئے ایسا شور مچائیگا۔ میں نے اسے کھڑکی پر نہ جانے دیا۔ بس اس نے چیختے چیختے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ ڈاکٹر کو بلوایا وہ ملا نہیں جب شام ہونے کو آئی تو سارا بنڈا اس طرح جلنے لگا کہ معلوم ہوتا کہ اگر دانہ ڈال دو تو بھُن جائے گا، میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں، ظہورن کے طعنوں نے دل بیکار رکھا تھا۔ میں سوائے دعائیں دم کرنے اور رونے کے کر ہی کیا سکتی تھی....."

ظہورن نے پھر بات کاٹی "اے تو میں طعنے کیوں نہ دیتی، خود ہی بچے کو مار پیٹ کے اس حال کو پہنچایا، اور خود ہی بیٹھ کے ٹسوے بہاتی تھیں، میں نے کہا اب بی بی بسورنے سے کیا فائدہ، جب نہ سوچا جب دھوئیں دھوئیں اسے پیٹ رہی تھیں....."

میں نے غصہ میں کہا۔ "پھر تم لڑنے لگیں۔ میں واقعہ پوچھتا ہوں اور تمھیں طعنوں سے ہی فرصت نہیں ملتی، صرف واقعہ بیان کرو اور کچھ نہیں۔"

ظہورن نے آزردہ ہو کر کہا "اے تو ہوا کیا بچے کی ایک چیخ آسمان پر تھی تو ایک

زمین پر۔ کچھ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں خدا بھلا کرے ان کا، یہ جو بی ہمسائی بیٹھی ہیں، ان کے میاں کو، انھوں نے باہر آکے آواز دی اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ ہیں نے ان سے داستان کہہ سنائی انھوں نے کہا۔ گھبراؤ نہیں، میں ابھی ڈانگڈر کو لئے آتا ہوں۔ وہ یہ کہہ کے جانے کو ہی تھے، کہ یہ نگوڑا مینہ پھٹ پڑا اور ٹھٹک کے کھڑے ہو گئے کہ ذرا پانی رکے تو میں جاؤں۔ ایسے عالم میں تو ڈانگڈر حکیم کوئی نہ ملے گا۔ ادھر بھیا کی یہ حالت تھی کہ جب کوندا لپکتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کوئی اسے کوڑے لگاتا ہے۔ بس ایک چیخ اوپر ایک نیچے۔ بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ ان ہمسائی سے اس کی چیخ نہ سُنی گئی اور بیتاب ہو کر اسی پانی برستے میں چھتری لگا کے کھڑکی پہ آئیں اور چیخ چیخ کر کھڑکی کھلوائی۔ ان کو دیکھتے ہی بھیا ان کی گود میں چلا گیا اور اس طرح سسک سسک کر رونے لگا، جیسے مدتوں کے بچھڑے مل کے روتے ہیں۔ انھوں نے لیتے ہی جیسے جادو کر دیا۔ . . . . ."

بی ہمسائی اب تک خاموش تھیں جادو کے لفظ پر چمک کے بولیں "تو بی میں نے کوئی جادو نہیں کیا، بیگم صاحبہ کی مارہ دھاڑ کھینچا تانی میں بچے کی کلائی کی رگیں کھنچ گئی تھیں۔ تم میں سے کسی نے ادھر دھیان ہی نہیں دیا تھا . . . . . "

ظہورن نے پھر بات کاٹی "اے اللہ جیتا رکھے۔ بٹیا تم نے میرے منہ کی بات لوک لی۔ میں تو خود یہی کہنے والی تھی۔ کہ بچے کھلاتے کھلاتے میرا چونڈا سفید ہونے کو آیا۔ اور اتنی بات نہ سوجھی۔ تم نے جو ذرا سا تیل کلائی میں مل کے اسے سینک کے لپیٹ دیا تو گویا جان میں جان آگئی۔ پھر بھی جب سے تم ہی لئے بیٹھی ہو، چیخ تو بالکل کم ہو گئی مگر بخار اسی طرح ہے

پھر تم نے کیسا کیسا بہلایا کیسا کیسا گانا سنایا......"

گانے کا نام سنتے ہی مجھے بی ہمسائی کا پیشہ یاد آگیا اور بیساختہ میرے چہرے پر ان جذبات حقارت و نفرت کے آثار نمایاں ہوگئے، جو میرے دل میں اس پیشے کی عورتوں کی طرف سے بھرے پڑے تھے۔ اللہ اللہ میں اور ایک قحبہ کا احسانمند! میرا گھر اور ایک بازاری رنڈی، میرا بچہ اور ایک فاحشہ کی گود!

ہمسائی نے میرے چہرے کو بغور دیکھا۔ نظریں نیچی کر لیں اور بچے کو آہستہ سے اٹھا کر ماں کی گود میں دے دیا، ایسا معلوم ہوا جیسے پھولوں کی سیج سے اٹھا کر اسے کانٹوں کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس لئے کہ بھیا نے ایک بار آنکھیں کھول کے ماں کا چہرہ دیکھا اور پھر چیخنے لگا۔ بیگم نے لاکھ جتن کئے، چمکارا، پیار کیا۔ گلے سے لگائے اٹھ کے کھڑی ہو گئیں، ٹہلا ٹہلا کے لوری دیتی رہیں، مگر بقول ظہورن کے اس کی چیخ "ایک اور بڑھتی تو ایک بیچے"۔

ہمسائی اپنی جگہ سے اٹھ کے کمرے کے باہر دالان کے کنارے آکر کھڑی ہو گئی تھیں گویا اس انتظار میں تھیں کہ پانی کم ہو تو وہ گھر واپس چلی جائیں۔ میں اب تک اسی طرح بھیگا کھڑا تھا۔ مجھے غصہ بھی تھا اور ڈر بھی۔ استعجاب بھی تھا اور تکلیف بھی، غرض اتنے قسم کے جذبات بیک وقت میرے دل میں جمع تھے، کہ مجھے اپنی جسمانی اذیتوں کا خیال تک نہ تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ہمسائی کی خوشامد کر کے بھیا کو گود میں لے لینے پر راضی کر لوں۔ مگر اپنے معصوم کو ایک معصیت پرور آغوش میں دینے سے کراہت معلوم ہوتی تھی، میں اسی حیص بیص میں تھا کہ ماں نے خودداری پر فتح پائی اور بیگم نے ہمسائی سے گڑگڑا کے کہا، "بہن تم پھر لے لو۔ یہ تمہاری

ہی گو دہیں چپ رہے گا۔"

ہمسائی نے میری طرف ایک بار دیکھا۔ میرا چہرہ بھی بجائے حقارت و نفرت کے اب عاجزی اور خوشامد کے آثار ظاہر کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنا آغوش پھیلا کے بھیا کو لے لیا اور انبساط سے گنگنا کے اسے چمکارنا شروع کیا۔ بچے کی چیخ میں آہستہ آہستہ کمی ہونے لگی، وہ آنکھیں کھول کے ہمسائی کا منہ اس طرح تکنے لگا جیسے وہ ان کی زبان سے کسی خاص چیز کا سننے کا مشتاق ہے، ہمسائی اس پر مسکرائیں اور کرسی پر بیٹھ کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غالب کی وہی غزل گانے لگیں۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

بچہ اطمینان سے مسکرایا اور آنکھیں جھپکانے لگا۔

میں خود فراموشی کی حالت میں یہ سب دیکھ رہا تھا کہ بیگم نے میرا شانہ ہلا کے کہا "یہ بھیگے کپڑے کب تک پہنے رہیئے گا؟" میں اس طرح چونک پڑا جیسے میں گہری نیند سے جگایا گیا ہوں، مجھے اس وقت اپنی حالت کا خیال آیا۔ یہ دوسری بار ایک ہی شب میں بری طرح بھیگا تھا اور دونوں بار سارے کپڑے جسم ہی پر قریب قریب خشک ہو گئے تھے۔ سویا بھی نہ تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ بھی تھا اور بھوکا بھی۔ مجھے اسوقت یاد آیا کہ مجھے بڑی دیر سے ایک غیر معمولی ٹھنڈک سی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ میں جلدی سے دوسرے کمرے میں کپڑے اتارنے چلا گیا۔

میں کپڑے بدل ہی رہا تھا کہ مجھے سخت سردی معلوم ہوئی۔ ساتھ ہی کچھ چکر سا بھی

محسوس ہوا۔ میں جلدی سے اپنے پلنگ پر آ کے کمبل اوڑھ کے پڑ رہا۔ سردی بڑھتی ہی گئی۔ میرے جسم پر گھر بھر کی رضائیاں، دلائیاں اور کمبل لا کے ڈال دیئے گئے۔ مگر میری سردی کم نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ بیگم کو بجائے "بھیا" کے ساری توجہ میری طرف مبذول کرنا پڑی اور وہ ہمسائی کے سامنے ہی ساری دلائیاں اور کمبل دبا کے میری پیٹھ سے لگ کے بیٹھ گئیں۔ آدھ گھنٹے کے سخت لرزے کے بعد مجھے تیز بخار آ گیا اور میں بیہوش ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ تین دن تک میں کس عالم میں تھا۔ کسی وقت ایک سو چھ ڈگری سے بخار کم نہیں ہوا۔ سرسامی بک جھک علیحدہ تھی۔ بار بار یہی کہتا تھا "میرا بچہ اور بیسوا کی گود! بھیا اور ناپاک آغوش میں! میرا پھول اور میلے کے ڈھیر پر! یہ اشرف سے ذلیل شخص سے ملنے کا نتیجہ ہے! ہائے ابا جان زندہ ہوتے تو کیا کہتے! گانے بجانے والی رنڈی اور میرا گھر۔ مولویوں کا خاندان، مفتیوں کا گھرانا!" ہمسائی اور اشرف دونوں نے یہ سرسامی بڑ بار بار سنی۔ مگر باہر اور اندر یہ دونوں میری اور بچے کی خدمت میں حد درجہ خلوص سے منہمک و مشغول رہے۔ اشرف صاحب ڈاکٹر کو بلاتے تھے۔ دوائیں لاتے تھے۔ اور روپیوں کا بندوبست کرتے تھے اسلئے کہ گھر میں جتنے روپے تھے وہ سب خرچ ہو چکے تھے اور بنک سے بغیر میرے دستخط کے نکل نہ سکتے تھے۔ اندر ہمسائی کی یہ حالت تھی کہ دن بھر بھیا کو لئے رہتیں اور تیمارداری اور خدمت میں بیگم کا ہاتھ بٹاتیں۔ بیگم تو کبھی کبھی تھک کے میرے پاس والے پلنگ پر سو جاتیں مگر ان کا بیان ہے کہ بی ہمسائی خواہ دن میں سوئی ہوں تو سوئی ہوں۔ لیکن تین راتیں تو اس اللہ کی بندی نے پلک سے پلک نہیں ملائی"۔

چوتھے دن مجھے ہوش آیا۔ اور سول سرجن جس کا علاج ہو رہا تھا بولا "اب کوئی خطرے کی بات نہیں"۔ دو دن اور اشرف صاحب باہر اور ہمسائی اندر دونوں میرے مکان میں آتے جاتے رہے۔ تیسرے دن ہمسائی تھوڑی دیر کے لئے آئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو بیگم اتفاق سے ان سے باتیں کرتی کھڑکی تک چلی گئیں۔ جب ہمسائی اپنے مکان میں پہنچ گئیں تو انھوں نے کھڑکی اپنی جانب سے بند کر کے قفل ڈال دیا اور کواڑوں کی آڑ سے بولیں "بیوی اب ماشاء اللہ بھیا بھی اچھا ہے اور اس کے باپ بھی۔ مولوی صاحب کو ضعف البتہ ہے، وہ بھی دو چار دن میں چلا جائیگا۔ مگر میری اتنی بات یاد رکھئے گا کہ جس دن ان کا غسل صحت ہو، تو بیسن اور صابون کا ذرا زیادہ انتظام کیجئے گا۔ اور ان سے کہہ دیجئے گا کہ اپنے کو اور بھیا کو اچھی طرح سے پاک کرلیں۔ ایک میری ناپاک گودوں میں ہفتہ بھر رہا ہے اور دوسرے کو میں نے اپنے نجس ہاتھوں سے کئی بار چھوا ہے۔"

بیگم "بہن، بہن، ارے کھڑکی تو کھولو بہن!" کہتی ہی رہیں، مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ یہ بھی وہاں سے حد درجہ رنجیدہ پلٹ آئیں اور گھر کے کسی کام میں لگ گئیں۔

اس واقعے کے دوسرے ہی دن صبح کو، جب میں اٹھا تو طبیعت چاق تھی، محض ضعف تھا اور کسی قسم کی کوئی شکایت نہ تھی، میں نے اس دن بیگم سے گھر کی حالت اور بیماری کی ساری کیفیت سنی۔ جب مجھے اپنی سرسامی بک جھک کی خبر ملی اور یہ معلوم ہوا کہ اشرف اور ہمسائی نے باوجود ان تمام باتوں کے عزیزوں سے زیادہ محبت و مروت برتی، تو مجھے حد سے زیادہ خجالت و ندامت ہوئی۔ مجھے اس روز محسوس ہوا کہ رذیل و

شریف کا فرق حد سے زیادہ مشکل ہے اور سوسائٹی کے قوانین کی پابندی میں افراط بعض وقت خود ہمیں بداخلاق و بدتہذیب بنا دیتی ہے۔ چنانچہ میں نے حد درجہ شرمسار و منفعل ہو کے بیگم سے کہا، "للہ ہمسائی کو بلاؤ۔ میں ان سے معافی مانگوں گا۔ میری اخلاقی حالت ان سے پست تر ہے۔ مجھے ان کو ذلیل کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔"

بیگم نے کھڑکی خوب خوب کھٹکھٹائی اور "بہن بہن" کہہ کے پکارا مگر صدا نہ برخاست میں نے ظہورن سے کہا کہ "امامن کو بھیج کے اشرف صاحب کو بلواؤ۔" وہ تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ معلوم ہوا وہ لوگ کل شام ہی کو اس مکان سے اٹھ گئے!

میں اپنے ضعف کی وجہ سے مجبور تھا، ورنہ اسی وقت ان لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ دو دن اور اسی مجبوری میں گرفتار رہا۔ تین دن کے بعد ڈاک سے ایک لفافہ ملا۔ چاک کر کے پڑھا تو لکھا تھا۔

"مکرم مولانا تسلیم۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج اب بالکل اچھا ہو گا۔ بخار تو ہمارے سامنے ہی اتر گیا تھا۔ صرف ضعف تھا۔ یقین ہے کہ اب جب کہ ہمسائے سے ناپاک ہستیاں اٹھ گئی ہیں تو وہ بھی جاتا رہا ہو گا۔ بھیا البتہ اپنی خالہ کے لئے کڑھتا ہو گا۔ مگر میں کیا کروں، مجھے اس سے زیادہ تکلیف ہے وہ تو بچہ ہے بہل ہی جائیگا مگر خود میرے پہلو میں ایسا ناسور ہے کہ جس کا اندمال محال ہے، مجھے اس کی "خالہ" اور آپ کی "نئی ہمسائی" سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ اور اس نے محض آپ کی وجہ سے ہم دونوں کو چھوڑ دیا۔ میں نے آپ سے درمیان گفتگو میں ایک بار کہا تھا کہ میں نے اس صورت کی، اس گلے کی اور اس دل کی رنڈی

نہیں دیکھی، صورت تو آپ نے دیکھ لی ہے۔ آپ خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں، گلے باری کی حالت
آپ کیا جانیں۔ مولوی آدمی، مگر اتنا تو شاید آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ کہ بھیا کیسی ہی تکلیف میں
کیوں نہ ہو کتنا غصہ ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں "خالہ" نے کچھ گنگنا دیا اور وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ رہا
دل! ہائے کیسے کہوں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے گا۔ مگر اس نے آج تک باقاعدہ پیشہ نہیں کیا
وہ محبت کی بھوکی اور اپنے مادری پیشے سے متنفر ہے۔ پھر اتنی ملنسار۔ اتنی خوش خلق، اتنی فطرتاً
نیک ہے کہ شاید ہی کوئی "شریف زادی" اس کے مقابلہ میں پیش کی جاسکے۔ بس اسی سے سمجھ لیجئے
کہ آپ کی اور بھیا کی بیماری میں میں نے روپئے نہیں خرچ کئے ہیں۔ میرے پاس اتفاق سے
ایک پیسہ نہ تھا۔ اسی نے کئی سو روپئے اپنے زیورات رہن رکھ کر دیئے ہیں! اس طرح کی عورت
اور اس کے ساتھ آپ کا یہ ظالمانہ برتاؤ کہ "اُٹھتے بیسوا، بیٹھتے کسبی"۔ واللہ دل پھٹ گیا! جس
دن وہ آپ کے ہاں سے آئی ہے، اسی دن شام کو وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے
ماں کے ہاں چلی گئی۔ میں نے ہاتھ جوڑے، قسمیں دیں کہ مجھ سے نکاح کرلے مگر اس نے کہا "نہیں
میں بیسوا کے گھر میں پیدا ہوئی بیسوا ہی بن کے رہ سکتی ہوں شریف نہیں بن سکتی! اللہ تو یہ
قبول کرسکتا ہے مگر انسان نہیں بخش سکتا ہے، وہ اور اس کے قانون، خدائی قانون سے بھی
زیادہ سخت ہیں! میں نے غلطی کی کہ میں نے شریف بننے کی کوشش کی۔ مجھے اپنے کئے کا پھل
ملا۔ مجھے مولوی صاحب کے بچے سے محبت ہے۔ میں تم دونوں کو کبھی نہ بھولوں گی۔ مگر میں تم دونوں
کو اب کبھی گلے نہیں لگا سکتی۔ اس لئے کہ میں رذیل ہوں اور تم شریف، میں ناپاک ہوں اور تم پاک"!
میں اس دن کے بعد سے اسوقت تک اس کی ماں کے کوٹھے کے کوئی دس پھیرے

کر چکا ہوں۔ مگر وہ مجھ سے نہ ملی، اس نے کہلا دیا "سمجھ لیں کہ مر گئی۔ میں ان سے زندگی بھر نہ ملوں گی!" میں نے اسی لئے یہ حتمی قصد کر لیا ہے کہ چونکہ آپ میرے لئے اس "عذاب الیم" کا باعث ہوئے ہیں لہٰذا میں بھی آپ سے زندگی بھر نہ ملوں گا۔ میں یہ خط آپ کو اسی لئے لکھ رہا ہوں تاکہ آئندہ آپ مجھ سے ملنے کی کوشش فرما کر مجھے رنج نہ پہنچائیں۔ زیادہ والسلام۔

خیر طلب "اشرف"

میں نے اسی وقت فٹن کسوائی اور بھیا کو ساتھ لے کر اشرف صاحب کے ہاں پہنچا۔ جب اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہلا بھیجا میں نہیں مل سکتا۔ جو لڑکا پیغام لایا تھا میں نے اس کے ہاتھ میں بھیا کا ہاتھ دے دیا اور کہا اسے ان کے پاس لے جاؤ۔ بھیا جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر میں نے سمجھا بجھا کے اسے اندر بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اشرف صاحب بچہ کو گود میں لئے ہوئے باہر آئے۔ اور مجھ سے منہ پھیر کے حد درجہ غصے سے بولے "فرمایئے کیا ارشاد ہے؟" میں نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور ان کے قدموں کیطرف بڑھ کے کہا "بھئی معاف کر دو!" اور ہم آبدیدہ ہو کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے!

جب آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسو پی چکا تو میں نے کہا "بھئی میں اس کی کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ غلطیوں کی تلافی ہو جائے اور بچھڑے مل جائیں!"

انھوں نے کہا "مگر اس کے لئے آپ کو اسکی ماں کے کوٹھے پر چلنا ہو گا!"

میں نے کہا "میں اس کے لئے تیار ہو کے آیا ہوں۔ آپ میری رہنمائی کریں، انشاءاللہ ناکامیاب نہ پلٹوں گا، آخر بی ہمسائی یہ تو دیکھ لیں کہ میں نرا مولوی ہی نہیں ہوں۔ بلکہ انسان

بھی ہوں!" غرض ہم لوگ فٹن پر سوار ہوئے اور چوک پہنچے، اور عمر میں پہلی بار میں سارے بازار کے سامنے دن دھاڑے میں اپنے معصوم بچے کو لئے ہوئے ایک رنڈی کے مکان پر چڑھ گیا، پاؤں میں رعشہ ضرور تھا، اور میری پیشانی پر پسینے کے قطرے یقینی طور پر موجود تھے اور میری آنکھیں شرم سے بلاشبہ جھکی جاتی تھیں، مگر میرا دل ہر ذلت کے لئے آمادہ تھا، میں خوش تھا کہ آج میں محبت وانسانیت کی دیوی کے حضور میں اپنی خود بینی وخودداری کی قربانی چڑھا رہا ہوں!

ہم لوگ ایک تنگ زینے سے ہو کر ایک چھوٹے سے صحن میں پہنچے۔ سامنے والے کمرے میں ایک ادھیڑ عورت بیٹھی تھی اور اس کے گلے سے چمٹی ہوئی بی ہمسائی رو رہی تھیں۔ ہم لوگوں کے پاؤں کی آواز سن کے ہمسائی ماں کے سینہ سے آنسو پونچھتی علیحدہ ہوئیں، اور مجھے دیکھ کے گھبرا کے کھڑی ہو گئیں، میں نے جلدی سے ببا کو گود میں اٹھا کے ان کی طرف بڑھایا۔ ان کا ہاتھ فطرتاً پھیل گیا، مگر وہ کچھ سوچ کے جھجکیں، میں نے کہا" یہ اپنی خالہ کی تلاش میں یہاں تک آئے ہیں" بچے نے بھی دونوں باہیں پھیلا دیں۔ بڑی محبت سے "خالہ! خالہ" کہا۔ اور ہمسائی نے روتے ہوئے اُسے آغوش میں لے کے گلے سے چمٹا لیا۔

بڑی بی نے اشرف صاحب سے کہا" اشرف میاں، بٹیا نے جب آپ سے کہہ دیا۔ کہ وہ اب آپ سے نہیں ملنا چاہتی تو پھر آپ اسے کیوں پریشان کرتے ہیں؟"

میں نے آگے بڑھ کے کہا" آپ پہلے میری دو باتیں سن لیجئے۔ پھر اشرف صاحب سے کچھ کہیئے گا"

بڑی بی بولیں "فرمایئے"

میں نے کہا "یہ تو آپ شاید جانتی ہوں گی کہ اشرف صاحب اور آپکی صاحبزادی سے محبت ہے۔ وہ ان سے نکاح کرنا چاہتے ہیں ماشاءاللہ رئیس ہیں، صاحب جائداد ہیں، بن بیاہے ہیں، ایک سے ایک لڑکی انہیں مل سکتی ہیں۔ لیکن وہ انہیں کے گرویدہ ہیں اور انھیں کے عاشق اور وہ بھی غالباً ان سے محبت کرتی ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان دونوں کا عقد بہتر اور ضروری نہیں؟"

بڑی بی بولیں "میاں میں نے کب کہا کہ بہتر نہیں، مگر خدا جانے کیوں وہ ان سے نہیں ملنا چاہتی، حالانکہ انھیں کیلئے روتی بھی ہے کڑھتی بھی ہے ......"

ہمسائی نے کہا "اماں، اماں، ...."

بڑی بی بولیں "چل چھوکری، میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے ہیں۔ اس وقت میری باتوں میں دخل نہ دے ......"

میں نے کہا "آپ کی صاحبزادی کو میری ذات سے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ اسی لئے وہ اشرف صاحب سے بھی خفا ہو گئی ہیں۔ میں نے انھیں بیسوا اور قحبہ کہا اور انھیں اپنی عورتوں سے نہ ملنے دیا، وہ اسی پہ آزردہ ہیں ......"

بڑی بی بولیں "تو میاں آپ نے بڑی زیادتی کی، آپ مجھے یہ سب کہہ سکتے تھے مگر اسے نہیں قسم لے لیجیے جو سوائے اشرف میاں کے ......"

میں نے گھبرا کر بات کاٹی اور کہا "تو میں اسی لئے تو آج معافی مانگنے آپ کے

کوٹھے پر آیا ہوں ..... "

میں یہ کہہ کے ہمسائی کی طرف پلٹ پڑا۔ وہ اس وقت تک بھیا کو کلیجے سے لگائے تھیں، وہ بھی ان کی صورت دیکھ دیکھ کر کھلا جاتا تھا اور بس ایک بات کی رٹ لگائے تھا "کھالا گھر چلو، کھالا گھر چلو"

میں نے ہمسائی سے بہت ہی لجاجت سے کہا "بی ہمسائی اب خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دو، واللہ تم میرے ایسے لاکھ شریفوں سے بہتر ہو! دیکھو بھیا تم سے کس کس طرح گھر چلنے کو کہہ رہا ہے۔ تمہاری بہن سخت انتظار کر رہی ہیں۔ مجھے حکم ہے کہ میں تمہیں لے ہی کے پلٹوں۔ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جا سکتا، پھر اپنی اور اشرف صاحب کی زندگی۔ میری غلطیوں کی وجہ سے کیوں برباد کرو؟ تم ہمسائے میں نہیں۔ میرے گھر چلو تمہاری بہن اپنے ہاتھوں سے تمہیں دلھن بنائیں گی۔ میرے ہی گھر سے تمہاری شادی ہوگی۔ میرے ہی پڑوس میں تم دونوں ہمیشہ رہو گے اور میں زندگی بھر تمہیں اپنی حقیقی سالی اور چھوٹی بہن سمجھوں گا اور تمہاری خدمت کروں گا۔"

ہمسائی نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔ بھیا نے پھر کہا "کھالا گھر چلو"۔ میں نے کہا۔ "دیکھو تمہارا بھانجا کیا کہہ رہا ہے۔ اگر میری بات نہیں مانتیں تو اس کی بات مان لو" ہمسائی نے گھبرا کے ماں کا منہ دیکھا۔ وہ بولیں "بی بی میں تمہاری باتوں میں دخل دینا نہیں چاہتی مگر اتنا کہے بغیر بھی جی نہیں مانتا کہ اشرف میاں کا سا چاہنے والا میاں اور مولوی صاحب کے ایسے شریف ہمسائے رنڈیوں اور کسبیوں کو نصیب نہیں ہوتے!"

میں نے کہا "اشرف صاحب! خاموش کھڑے ہم لوگوں کا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ کسی سے کہہ کے ڈولی منگواؤ"
انھوں نے ہمسائی کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔ ان کی مسکراتی ہوئی آنکھوں پر بھیا نے
اپنا پھول سا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس کی اس شوخی پر کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔

میں نے اشرف صاحب سے پھر کہا۔ "ارے یار ڈولی منگواؤ، تم اب تک کھڑے منہ دیکھ رہے ہو!"

بڑی بی نے کہا۔ "اے تو یونہی، نہ سر میں کنگھا، نہ بال میں تیل، نہ زیور پہنے، نہ کپڑے بدلے!

میں نے کہا۔ "ہاں، ہاں یونہی! میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے! اور پھر میں
تو بی ہمسائی کا فرضدار بھی ہوں۔"

بڑی بی نے گھبرا کے میری طرف دیکھا۔ ہمسائی نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے
مجھے کچھ کہنے سے منع کیا۔ اور جلدی سے بولیں۔ "تو ڈولی تو منگوایئے!

بھیا نے خوش ہو کے اپنی خالہ کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ گویا گلاب پر گلاب رکھا تھا۔ کس
کی مجال تھی کہ کہتا ایک نجس ہے، دوسرا طاہر، ایک ناپاک ہے۔ دوسرا پاک۔ محبت کی شعاعیں
دونوں کے چہروں کو نورانی کر رہی تھیں۔ اور دونوں کی آنکھیں روحانی مسرت سے چمک
رہی تھیں۔

میں نے دل میں کہا "مولویانہ پن ان پر سے قربان اور قدامت پرستی ان پر سے نچھاور!

عدیا تنبولن

عدیا تنبولن قصبہ بھر میں بدنام تھی جس وقت دیکھو اس کی چھوٹی سی پان کی دوکان کے گرد جمگھٹ لگا ہے۔ وہ یا تو لوگوں سے مذاق اور لگاوٹ میں دن کاٹتی یا پھر ایک چھوٹی سی ڈھولک گلے میں ڈالے ہفتہ کی کوئی چیز بے سُرے پن سے الاپتی رہتی تھی، اسے اسکی پروا نہ تھی کہ محلہ بھر کی عورتیں اس کو بُری نظر سے دیکھتی ہیں یا بڑے بوڑھے اس کے بے ہنگام گانے بجانے سے عاجز ہیں اسے اپنے پان بیچنے اور دل بہلانے سے کام تھا وہ نہ ہی اخلاقیات کی پابند تھی اور نہ مروجہ قانون معاشرت کی، لیکن اسی کے ساتھ اس میں مروت بہت تھی؛ یا یوں کہئے کہ مغربی آزاد خواتین کی طرح وہ بھی با اخلاق تھی، جب کسی کی جان جاتے دیکھتی، کسی کو زہر کھاتے سنتی یا کسی کے چھری مار لینے کی دھمکی کی خبر پاتی تو وہ دل دہی ضرور کرتی اور

بعض وقت اپنی خودداری کا تھوڑا سا خون کر کے ان آفت کے ماروں کی جان ضرور بچا لیتی، اس قربانی میں نہ تو اسے کوئی اذیت تھی اور نہ لذت، یہ صرف انسانی فرض شناسی کا نتیجہ تھی۔ ان حرکات سے نہ تو اس کی روزمرہ کی زندگی میں فرق آتا اور نہ معمولات میں۔ نہ پان کی دوکان قبل از وقت بند ہوتی اور نہ ڈھول بجانے میں کوئی کمی و زیادتی ہوتی۔

ہاں مگر اسے کشش اعصاب کہیئے یا جذب دل کہ جب کبھی کریم محمود پور والا، اپنی غرض کا بندہ، بھولا بھٹکا کرشن پور آنکلتا تو عدیا کی دنیا میں انقلابِ عظیم دکھائی دیتا۔ اس روز بارہ بارہ بجے تک کھلی رہنے والی دوکان، سرِشام ہی بند ہو جاتی اور ٹوٹے ہوئے مکان کے دروازہ پر خواہ کتنی ہی آوازیں لگائی جائیں مگر وہ کھلتا ہی نہ تھا۔ حالانکہ تھوڑی دیر کے بعد ڈھول کی آواز کے ساتھ ساتھ اس طرح قہقہوں کی آواز آتی تھی جیسے ہنسی پھوٹی پڑتی ہے اور دل کا کنول کھلا جاتا ہے ہمسائے جب ان قہقہوں کو سنتے تو غصہ کے ساتھ دل میں خوف بھی پیدا ہوتا، اس لئے کہ کریم ان اطراف کا مشہور بدمعاش تھا۔ ایسے آدمی کا قصبہ میں موجود ہونا ہی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ نہ معلوم کسی کے گھر میں چوری کرا دے۔ کسی کی ناک کاٹ لے یا کسی کی آبرو اتار لے۔ مارے ڈر کے کوئی دم نہ مارتا تھا، لیکن ہر ایک اپنی جگہ پر گھٹتا ضرور تھا۔ قصبے کی لڑکی خراب جا رہی تھی اور وہ بھی ایک پرلے سرے کے بدمعاش کے پیچھے انسانی فطرت ہے کہ اگر کسی کی برائی سے اپنے کو فائدہ پہونچتا ہو، تو وہ قابلِ عفو و درگزر بنائی جاتی ہے، لیکن اگر وہ کسی غیر کے لئے مفید ہو یا اس سے کوئی دشمن فائدہ اٹھائے تو وہ ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے یہی وجہ تھی کہ جو لوگ عدیا کی اسی طرح کی

نیکی یا بدی کی بدولت آج تک زندہ تھے وہی کریم کے سب سے زیادہ مخالف تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ موش دوانیاں کرتے۔ عدیا کو سمجھاتے۔ جھڑکتے، ڈانٹتے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ جب وہ ان کے ساتھ اخلاق برتنے میں پورے قصبے کی حمیت کے مجروح کرنے میں پس و پیش نہ کرتی، تو پھر دل کی پیاس بجھاتے ہیں وہ اپنے ان بندوں کے محزون ہونے کی کیا پرواکرتی! یہ لوگ جلتے اور جی بھر کے جلتے..... اور جب کبھی یہ سنا جاتا کہ کریم نے عدیا کو نکاح کا پیام دیا ہے تو بڑے زور سے سر ہلا کے کہتے " اجی بالکل غلط! نہ معلوم اس کی ان کی سی کتنی اور ہونے والی بیویاں بیٹھی ہیں، موقع آنے تو دو، وہ اس بُری طرح عدیا کو دھوکا دے گا کہ اسے بھی عمر بھر یاد رہے گا۔"

شیطان تو ایسے کاموں میں شریک ہوتا ہی ہے، اس نے بھی کہیں سن لی اور عدیا کو کیفرِ کردار تک پہونچانے اور کریم کے رقیبوں کو سچا ثابت کرنے کی صورت پیدا کر دی۔ کچھ ہی دنوں بعد عدیا میں وہ کیفیتیں پیدا ہونا شروع ہو گئیں، جو مردوں کی نظر میں عورت کو عدد رجہ مکرہ بنا دیتی ہیں۔ مگر جن آثار کے نمایاں ہونے کا ہر محبت کرنے والا شوہر بڑے ارمانوں کے ساتھ منتظر رہتا ہے۔ متلی۔ دورانِ سر۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور پیٹ کا سنتو کھانے والے بنیوں کی طرح پھولنا، غرض عدیا نے معشوقہ کا جاذب نظر جامۂ زرتار اُتار اور "ماں" کی بھدی مگر تخلیقی وضع اختیار کی۔

اب نہ تو میاں کریم کے دعدوں کا کہیں پتہ تھا، اور نہ اُن کی اکڑتی بدلتی ہوئی صورت کا۔ دن گذرے۔ ہفتے گذرے۔ مہینے بیت گئے۔ عدیا کی دوکان کئی کئی دن بند رہتی۔ مکان سے

کئی کئی وقت وھواں بلند ہوتے نہ دکھائی دیتا۔ لیکن کریم نظر نہ آتا۔ وہ شہد کی مکھی کی طرح بور کے زمانے تک تو دکھائی دیا لیکن ثمر آتے ہی روپوش ہو گیا۔ نہ شرع نے ہاتھ پکڑایا تھا، نہ رسم و رواج نے مانگ بھروائی تھی۔ اب اس بالہ کو کون اپنے ذمہ لے؟ قصبہ کے وہ نوجوان جو آئے دن زہر کھایا کرتے تھے اب وہ بھی پان کھانے تک کے لئے تیار نہ تھے۔

لیکن انھیں میں ایک بیوقوف بھی تھا، بقر عیدی نام، وہ ایک رئیس کے ہاں چوکیداری کے فرائض ادا کرتا تھا۔ رات کی نیند اس نے اپنے مالک کے مکان کے گرد چکر لگانے کی نذر کر دی تھی، اور دن کا آرام عدیا کی دوکان کے طواف پر چڑھا دیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کبھی نہ زہر کھانے کی نیت ظاہر کی تھی، نہ چھرا مارنے کا اعلان کیا تھا اور نہ جان دینے سے بچایا گیا تھا۔ وہ خاموش پرستش کرتا رہا تھا۔ محبوبہ کی بے بسی دیکھ کر اس کا دل بہت کڑھا، اور اس نے جی کڑا کر کے عدیا کو نکاح کا پیام دے ہی دیا۔ عدیا تو کریم کے پیچھے دیوانی تھی، اس نے صاف انکار کر دیا۔ بقر عیدی کو ہر ایک نے سمجھایا، طعنہ دیا۔ برا بھلا کہا۔ لیکن اس کے سر پر کسی معمولی پری کا سایہ نہ تھا، اس نے ایک کی نہ سنی، وہ برابر اصرار کئے ہی گیا اور بالآخر عدیا نے فاقوں کے ڈر اور کریم کی امید خبر گیری سے مایوس ہو کر، ہامی بھر لی۔ بقر عیدی دوسرے ہی دن دو ڈھول اپنے گھر باندھ لایا۔

کریم اس کے لئے تو تیار تھا کہ ساجھے کی ہانڈی کی طرح عدیا چوک کے چوراہے پر ہو۔ لیکن اس کے لئے آمادہ نہ تھا کہ اس پر مالکانہ تصرف کا حق کوئی دوسرا حاصل کرے

اس لیئے جب تک اس کا ڈر رہا کہ عیش و عشرت کی قیمت زچہ خانے کے اخراجات کی صورت میں کہیں ادا نہ کرنا پڑ جائے، اس نے کرشن پور کا رخ ہی نہ کیا، وہ ایک آزاد کردہ، داغے ہوئے سانڈ کی طرح دوسرے کھیتوں کو چرتا رہا۔ لیکن جب عدیا کی کفالت کا زمانہ گزر گیا اور وہ پھر اپنی دوکان پر بیٹھنے لگی، تو ایک دن مونچھوں پر تاؤ دیتا اس کوچہ سے پھر نکلا جس میں عدیا کی دوکان تھی۔ دل میں دُگدھا تھا ممکن ہے ملتفت ہو یا نہ ہو۔ اس لیئے پہلے ہی سے اکڑا ہوا تھا کہ جھینپ نہ ہونے پائے۔ مگر عدیا اسے دیکھتے ہی اس طرح بیساختہ مسکرا دی جس طرح نسیم سحر کے اولیں جھونکے میں غنچۂ ناشگفتہ مسکراتا ہے۔ کریم سو گز کے فاصلہ سے اس طرح تن کر زمین پر پاؤں رکھنے لگا، جس طرح لقا کبوتر چلتا ہے، وہ خراماں خراماں آیا، اس نے عدیا کی ٹھوڑی کے نیچے دو انگلیاں لگا کے اس کے اٹھے ہوئے سر کو اور بلند کیا۔ پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا، "کہو اچھی تو رہیں؟"

سوال نہ تھا بلکہ شکوہ و شکایت کے دفتر کھلنے کی درخواست۔ لیکن جب محبت کا حیوانی عنصر سب عناصر پر عنصر غالب کی حیثیت رکھتا ہو تو عورت بھی قربانیوں پر آمادہ ہو جاتی ہے، ایسے موقع پر اس پورے دفتر میں دو چار رسمی فقروں سے زیادہ کچھ نہیں ملتا چند ہی منٹ میں، سارے گلے تمام ہوئے۔ "شکوہ شکریہ میں بدل گیا اور شکایت احسانمندی میں، راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ کریم نے کچھ عہد لیا، کچھ عہد کیا اور گھر کی سدھ بھری۔

اس دن سے پھر یہ معمول سا ہو گیا، کہ جب بفر عیدی شب کو نو بجے کے قریب کھا پی کر چوکیداری کے فرائض ادا کرنے چلا جاتا، تو پشت مکان والی کھڑکی سے کریم چلا آتا، اور

پھر ناکتخدائی والے دور کی طرح تھوڑی دیر رُک رُک کے ڈھول کی آواز سنائی دیتی،
یا پھر ایسے قہقہوں کی جو کاسۂ میخوار میں شراب ڈھالتے وقت صراحی کی گردن سے نکلتے ہیں،
یا جو پتھریلی زمینوں پر شیریں چشموں کے بہنے میں پیدا ہوتے ہیں!

بقر عیدی اس نئی زندگی سے بہت زیادہ دنوں تک ناواقف نہ رکھا جا سکا۔ کریم خاں
کے پچھلے رقیبوں میں سے ایک نے، جواب عدیا کی نگاہ میں ٹوٹے ہوئے قلم سے زیادہ وقعت
نہ رکھتا تھا، چغلی کھا کہ گویا ہمسائگی کے فرض سے سبکدوشی حاصل کی۔ بقر عیدی دانت پر دانت
بٹھائے سر جھکائے سب سنتا رہا۔ ہمدردی جتانے والے دوست نے بے غیرتی و بے حمیت
سمجھ کر طعنہ و تشنیع کی برچھیاں چلائیں، اس نے خاموشی کی سپر پہ یہ وار بھی لے لئے اور اپنے
کاموں میں لگ گیا، البتہ یہ خاص اثر ضرور ہوا کہ بقر عیدی جو باوجود کم گو ہونے کے عدیا کی
صحبت میں خاصا چہکنے لگا تھا، اب پھر بُت سا بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے بانسری کے منہ
میں اس طرح میل بھر گیا تھا کہ باوجود کوششوں کے آواز نکلتی ہی نہ تھی! ممکن تھا عدیا دوسروں
کی طرح اس فرق کو محسوس کر لیتی۔ لیکن وہ تو خود دونوں کے عوض چہکتی پھرتی تھی۔ دن کو
آنکھوں کا تارا، راج دلارا، اس کی گود میں ہوتا اور شب میں وہ خود محبت کے دیوتا کے
آغوش میں۔ اُس پر اس کا کیا اثر کہ بقر عیدی نے ادھر پھر منہ میں گھنگھنیاں بھر رکھی ہیں۔ وہ
تو اس کے نزدیک اس مضبوط ڈنڈے کی حیثیت رکھتا تھا جس کے سہارے وہ کنوار پنے کے
کے بوجھ کو سنبھال کے ازدواجی زندگی کے ساحل تک پہونچی تھی۔ سو وہ کٹھن منزل کٹ چکی تھی۔
اب تو وہ سبکسر تھی، اسے بقر عیدی کی "سرگرانی" کی کیا پروا؟

لیکن اس ہیزم خشک بقرعیدی میں آگ اچھی طرح لگ چکی تھی، ہاں نہ شعلہ تھا، نہ دھواں، اور نہ دل کی کھولن میں آواز۔ بس اتنا تھا کہ چہرے پر مسکراہٹ نے ایک کھلے زخم کی صورت اختیار کر لی تھی اور موقع بے موقع ہنسی نے کوہ آتش فشاں کے سینے میں پکنے والے لاوا کی آواز کی حیثیت! کسی کو کیا خبر تھی کہ

جگر میں درد تھا لب پر ہنسی تھی　　　پریشاں خواب ہے قصہ یہاں سے

بقرعیدی کے مکان کی پشت کی جانب دور تک بوسیدہ، افتادہ کھنڈروں کا ایک سلسلہ تھا ان کے عقب میں ایک گھنی بنسواڑی اور اس کے بعد خودرو کانٹے دار درختوں کا میلوں تک کا جنگل، اندھیرا ہونے پر قصبہ کا کوئی شخص کبھی ادھر نہ جاتا تھا مشہور تھا بنسواڑی میں سینکڑوں زہریلے سانپ رہتے ہیں اور جنگل میں چور ڈاکوؤں کے اڈّے ہیں۔

لیکن کریم جب بھی آتا تو اُدھر ہی سے، کھنڈروں کی جانب سے محمود پور قریب پڑتا تھا، پھر کریم کو چور ڈاکوؤں کا کیا ڈر، وہ تو اُن ہی میں کا تھا۔ عدیا البتہ اس خواہ مخواہ کی جسارت پر سہمتی، جھنجھلاتی، سمجھاتی اور اسی سلسلے میں دل کا مدعا بھی کہہ ڈالتی ”جان جوکھم ہے کیوں صدر دروازے سے نہ آوے، مجھے کیا کسی کا ڈر پڑا ہے، تم جس دن کہو تمھارے ساتھ ساری دنیا کو دکھا کے نکل چلوں!“

کریم ہنس کر ٹال دیتا، وہ شب پرندوں کی طرح پھل کھانے کے لئے تھا، نہ کہ باغ کی رکھوالی کے لئے! اُس کا کام دادِ عشرت دینا تھا نہ کہ ذمہ داریوں کا اپنے سر لینا! وہ اسی لئے

کبھی یوں بات بناتا کہ "تمھارے ہاں آنے میں اگر تھوڑا سا بھی خطرہ نہ ہو تو پھر لطف ہی کیا؟"
اور کبھی بنوٹ اور ظاہرداری سے کہتا "ارے تمھارے پہلو تک پہونچنے کے لیے اگر آگ میں
سے بھی ہو کر آنا پڑے تو تمھارا کریم نہیں جھجکنے کا" اور عدیا سارے پچھلے تجربات بھول کر اس لیے
اس کی باتوں کا یقین کر لیتی کہ اس کا یقین کرنے کو جی چاہتا تھا!

ایک بار کوئی دو بجے شب کے قریب، جب کہ کالی اندھیری ڈراؤنی رات اچھی طرح
بھیگ چکی تھی اور عدیا و کریم چہل میں مشغول تھے، دفعتاً بقرعیدی نے دروازہ کھٹکھٹا کر پکارا،
کریم بولا ہی چاہتا تھا کہ عدیا نے آواز پہچان کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور خود پوچھا "کون
ہے؟" بقرعیدی نے ذرا ڈانٹ کر کہا "میں ہوں بقرعیدی اور کون!" بقرعیدی کا نام سنتے
ہی کریم چور کی سی سراسیمگی کے ساتھ پلنگ سے اُچک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جلدی جلدی مکان
کے گوشے گوشے پر نظر ڈالی، گویا چھپنے کی جگہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ عدیا بھی گھبرا اٹھی تھی۔ بقرعیدی
کے اچانک آجانے نے حواس پریشان اور جرأت مقاومت سلب کر لی تھی، اس نے جلدی
سے پشت مکان والی کھڑکی کی جانب اشارہ کر دیا، کریم نے جھپٹ کر کھڑکی کھولی اور باہر
نکل بھاگا۔

بقرعیدی نے اس درمیان میں کئی آوازیں لگا ڈالیں "ارے کواڑ کھول۔ کیا کر رہی ہے؟"
عدیا نے کریم کے باہر جاتے ہی دھڑکتے دل کو سنبھالا، ذرا تیور بدل کر بولی "ارے آ رہے
ہیں۔ خواہی نخواہی دروازہ ہلا ہلا کر توڑے ڈال رہے ہو"

کواڑ کھلے، بقرعیدی درانہ اس انداز سے داخل ہوا جیسے گھر میں۔ کھا ہوا کوئی ہتھیار

لے کر کسی سے جنگ کرنے جا رہا ہے، وہاں حسبِ منشا مکان خالی تھا اور کھڑکی کھلی تھی۔ زیرِ لب اس طرح مسکرایا جس طرح صیاد صید کو جال سے قریب ہوتے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ بیوی سے پلٹ کے پوچھا۔ "ایں یہ کھڑکی کیسے کھلی ہے؟" وہ سٹ پٹا کے بولی۔ "میں کیا جانوں۔ میں تو سو رہی تھی۔" وہ بولا۔ "مجھے تو کھٹکا معلوم ہوتا ہے"! اور جو ناسپچ بائیں ہاتھ میں لیئے تھا اُسے جلا کر اپنی لاٹھی زمین پر پٹکتا، کھڑکی سے نکل کے کھنڈر کی طرف چلا۔

عدیا نے وقتی اضطراب سے مجبور ہو کر قدرے چیخ کر پوچھا۔ "ارے تم اُدھر کہاں جا رہے ہو؟" وہ کچھ نہ بولا۔ اور اپنی لاٹھی کو اسی طرح زمین پر پٹکتا آگے بڑھ گیا۔

کریم، ڈرپوک، بودا نہ تھا، لیکن چور کا دل آدھا ہوتا ہے آج بقر عیدی نے اُسے اپنی چوری کرتے گویا پکڑ لیا تھا۔ وہ اس کے مکان سے نکل کر کھنڈروں میں جا چھپا لیکن کچھ ہی منٹ بعد اسے بقر عیدی کی لاٹھی کی آواز سنائی دی۔ تعاقب کے خیال نے رہے سہے حواس اور بھی مختل کر دیئے، بنسواڑی اندھیرے میں حد درجہ خطرناک معلوم ہوتی تھی، مگر عدیا کے شوہر کی لاٹھی اس سے خطرناک تر تھی کہ الاماں والحفیظ، وہ پتلی سی پگڈنڈی جو اس میں سے ہو کر جنگل تک گئی تھی مطلقاً سجھائی نہیں دیتی تھی، لیکن خوف بری طرح مسلط تھا، دن میں اکڑ نے برنے والا کریم، اس وقت نہیں بھاگ رہا تھا، اور نہ سیدھا سادھا بقر عیدی اس کا تعاقب کر رہا تھا، بلکہ اس وقت کریم چور، خوفزدہ، لرزاں، ترساں و گریزاں تھا اور اس پر جو خوف طاری تھا وہ عدیا کے شوہر کا تھا، جس نے گویا اسے اپنی عزیز ترین شے کا سرقہ کرتے اپنے گھر ہی میں گرفتار کر لیا تھا۔

یہ دوسرا خوفزدہ کریم، بے تکان پیچھے پلٹ پلٹ کے دیکھتا ہوا بنسواڑی میں گھسا۔ اس نے دو چار قدم جلدی جلدی رکھے ہی ہونگے کہ دفعتاً اس کا پاؤں جھوٹا پڑا اور وہ ایک گڑھے میں گر پڑا۔

اس کا منہ مٹی سے بھر گیا۔ اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور اس کے سارے جسم میں حد درجہ تیز، نوکیلے، سخت بڑے اور مضبوط جنگلی کانٹے گھس گئے وہ آہ کر کے ایک کروٹ گرا۔ سارا پہلو فگار ہو گیا، اس نے ہاتھوں پر زور دیکر اُٹھنا چاہا۔ کانٹے ہتھیلیوں کو توڑ کر نکل گئے۔ اس نے پوری قوت سے جھٹکا دیکر ہاتھوں کو اس شکنجے سے علیحدہ کیا، پھر پاؤں پر سنبھل کر کھڑے ہونے کی کوشش بلیغ کی، جوتوں نے بڑی حد تک انکی حفاظت کی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے زخمی ہاتھوں سے گڑھے کے کنارے ٹٹولے۔ بارے وہ مل گئے، گڑھا اس کے قدہی بھر عمیق تھا۔ ایک ایک کر کے کنارے سے کانٹے ہٹائے۔ پھر ان ہی خون آلودہ ہاتھوں کے سہارے بڑی مصیبتوں بڑی کاوشوں سے گڑھے سے باہر نکلا ایک قدم لڑکھڑا کے چلا پھر منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ معلوم ہوا کوئی چکنی، نرم مگر سرکتی ہوئی شئے داہنے ہاتھ میں لپٹ گئی۔ کریم نے بدحواسی میں ہاتھوں کو زمین پر ٹپک ٹپک کر اپنے کو چھڑانا چاہا۔ مگر چھٹکارا نہ ملا۔ محسوس ہوا جیسے گرم گرم سلاخیں نرم کر کے ہاتھ میں لپیٹ دی گئی ہیں، وہ دفعتاً سمجھ گیا کہ یہ شئے سانپ ہے' وہ ایک بار خوف اور بے بسی سے چیخا اور بے ہوش ہو گیا!

بقر عیدی نے کھنڈروں سے چیخ سنی، ٹارچ کی روشنی ڈالی، کریم کو زمین پر

دراز بے حس وحرکت دیکھا۔ پھر زیرِلب ہنسا، بالکل اسی طرح جیسے بلی چوہے کو مار کر مسکراتی ہے، اطمینان کی سانس لی، گھر پلٹا۔ عدیا اسی طرح "آہٹ پہ کان" دھرے کھڑکی پر کھڑی ملی۔ بقرعیدی نے بہت ہی بے پروائی سے کہا۔ "کوئی بھی نہ تھا، معلوم ہوتا ہے تم ہی بھولے سے کھڑکی کھلی چھوڑ کر سوگئیں"۔!

یہ فقرہ عدیا کے دھڑکتے ہوئے دل کے لئے ٹھنڈا پانی بنا، ذرا سکون ہوا۔ فوراً تریا چلتر سے بولی۔ "اے تو آج یہ پہرہ دیتے دیتے کیوں ہیں نگوڑی یاد آگئی، جو مالک کا دروازہ چھوڑ اپنے گھر کی کھڑکی دیکھنے چلے آئے؟"

بقرعیدی نے خاموشی سے کھڑکی بند کی، کنڈی لگائی، پھر بولا۔ "اجی کچھ نہیں، بیڑی ختم ہوگئی تھی، سوچا چلو اسی بہانے گھر ہو آؤں، تمہیں بھی دیکھ لوں گا اور بیڑی بھی، ایک پنتھ دو کاج"۔

وہ بولی۔ "تو یہ موئی بیڑی لے آئی تھی۔ میں تو سمجھی تھی کہ۔۔۔۔۔"

بقرعیدی نے سنی کو ان سنی کرکے بیڑی کا بنڈل طاق سے اُٹھایا، پھر بیوی سے کہا۔ "لے اب تم کواڑ بند کرکے سو، میں جاتا ہوں"۔ اور اپنی لاٹھی اور ٹارچ لے کے چلتا بنا۔ عدیا دروازہ بند کرکے پلنگ پر بیٹھی اس طرح کی آواز سے ہنستی رہی جس طرح کی آواز سے مرغیاں اپنے بچوں کو چیل کے جھپٹے سے بچا لینے کے بعد اظہارِ مسرت کرتی ہیں

صبح دس بجے کے قریب عدیا دوکان پر بیٹھی ڈلی کاٹ رہی تھی اور بقرعیدی

بچہ کو گود میں لئے اس کی خوش فعلیاں دیکھ رہا تھا، کہ دفعتہً محلہ کا ایک لڑکا دوڑتا، ہانپتا کانپتا آیا اور خوف زدہ گھبرائی ہوئی آواز سے بولا "ارے عدیا بنسواڑی میں کریم مرا ہوا پڑا ہے"

عدیا کے ہاتھ سے سرو تا ڈلی کی ٹوکری میں آرہا اور وہ خود نیورا کے برگ خزاں دیدہ کیطرح لہراتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ اُسی لڑکے نے لپک کے اُٹھایا۔ پھر عبدی نے لڑکے کو گودی سے علیحدہ کر کے جلدی سے سہارا دینا چاہا۔ عدیا نے اُسے پھیلے ہوئے دیدوں سے گھور کے دیکھا اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ زمین پر بیٹھی تھوڑی دیر جھومتی اور لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی، پھر لڑکے سے پوچھا "کہاں بنسواڑی میں؟" اس نے کہا "ہاں" وہ ایک بار لڑکھڑا کے کھڑی ہوگئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے لہنگے کا اگلا حصہ سمیٹ کر زمین سے بالشت بھر بلند کر لیا اور دوڑتی ہوئی بنسواڑی کی طرف چلی، وہ ہانپتی جاتی تھی۔ اس کے منہ سے ایک بے معنی سی آواز نکلتی جاتی تھی اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں سمٹ سمٹ کر اس طرح پھیلتی تھیں۔ کہ معلوم ہوتا تھا کہ حلقہ چشم سے باہر نکل پڑیں گی!

وہ اسی بدحواسی، نیم دیوانگی کے عالم میں بنسواڑی پہونچی، وہاں دو چار آدمی جمع ہوگئے تھے۔ لوگ کریم کی لاش کو دور سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ قریب جاتا اس کے ہاتھوں کے پاس چوٹ کھایا ہوا افعی اب بھی پھن اُٹھا اُٹھا کے پھنکاریاں مار رہا تھا، عدیا اس مجمع کو چیرتی، اس طرح ہانپتی ہی کریم کے بےحس مجسمہ کے قریب پہونچی۔ جس کو اُس نے اکثر بڑی سج دھج سے دیکھا تھا اس وقت اس کے کپڑے پھٹے تھے اور وہ خون میں لت پت تھا۔ ٹانگیں بے قرینہ اینٹھی ہوئی تھیں، داہنا ہاتھ کہنیوں تک سیاہ

تھا اور اس سے سیاہی مائل پانی بہ رہا تھا، عدیا نے ایک چیخ ماری اور پورے قد سے
اس طرح کریم کے لاشے پر گر پڑی جس طرح سوکھے درخت کا وہ تنا خاک پر آرہتا ہے۔ جسے
آرے سے کاٹ کر ڈھکیل دیں۔

بقرعیدی بھی پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ بچہ اب تک گلے سے چمٹا تھا، وہ اسے اس طرح
بحفاظت لا رہا تھا جیسے بچہ گوشت و پوست کی جگہ نازک ترین شیشے کا بنا ہے۔ بنسواڑی
میں پہونچکر اس نے بیوی کو کریم کی لاش پر پڑا ہوا پایا۔ اس نے بچے کو مجمع کے قدموں میں
ڈال دیا اور بیوی کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پکارنا شروع کیا۔ "عدیا! ارے عدیا! کیا کر رہی ہے!
ہوش میں آ۔ عدیا"۔۔۔ عدیا نے آنکھیں کھولیں۔ پہلے تو دیدوں سے ظاہر ہوا کہ دنیا و
مافیہا کی خبر نہیں، بالکل سادے دھلے ہوئے کپڑوں کی طرح سپید، بے آب تھے، پھر
دفعتاً ان میں ایک سیاہی نما سرخی جھلکی، بالکل اس طرح کی جیسی کالے بادل پر شفق
گلگوں کی چھوٹ! اس کی نظر کریم، گڑھے، سانپ سے ہوتی ہوئی بقرعیدی کے چہرہ
پر آکر ٹھہری۔ وہ بیساختہ ہنسنے لگی اس طرح ہنسنے لگی جو دیوانوں کی خصوصیت ہے۔ وہ
بقرعیدی سے بولی"۔ اس لونڈے کا باپ یہی ہے۔ تم نہیں ہو! ہی! ہی! تم نہیں ہو!
تم نہیں! ہی! ہی! ہی! میں اپنے کریم کی بیوہ ہوں! تمہاری بیوی نہیں! ہی! ہی! ہی!

بقرعیدی نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر لیں اور کانپتے ہونٹوں سے کہا۔ "اچھا، اچھا، اچھا
گھر چل، اب تو وہ مر ہی گیا، اب گھر چل"۔ وہ دیوانہ وار بولی "۔ گھر! تمہارے گھر! ہی! ہی! ہی!
خونی کے گھر! ہی! ہی! ہی! میں تو اپنے پیارے کے گھر جاؤں گی! ہی! ہی! ہی! ۔۔۔۔۔"

اور اسی طرح بھیانک طور پر ہنستے ہنستے اُس نے لپک کر وہ کمر شکستہ سانپ پکڑ لیا، جو بار بار حملہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا، مگر ابھی تک عدیا کے جسم تک نہ پہونچ سکا تھا۔ افعی جان سے بیزار پہلے ہی خون کا پیاسا تھا اب جو نرم ہاتھوں کی ڈھیلی گرفت میں آیا، تو اس نے پلٹ کر اس قوت سے کاٹا کہ پشت دست لہو لہان ہو گئی! لوگ جب تک "ہائیں ہائیں" کہہ کر لپکیں عدیا کی غرض پوری ہو چکی تھی، سانپ اپنا پورا زہر اس کے جسم میں منتقل کر چکا تھا! بقر عیدی نے آگے بڑھ کر افعی کو ایک لکڑی سے مار کر گرا دیا اور بیوی کا ہاتھ تھام کر کہنی کے پاس سے باندھ دینا چاہا۔ عدیا نے جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا۔ ایک بار اُچھل کر وہ کریم کی لاش پر پھر گر پڑی۔ اُس نے دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈالدیں۔ اس کے خون آلودہ منہ پر منہ ملا، ہونٹوں اور آنکھوں کا پیار کیا اور سانپ کے زخمی کیئے ہوئے ہاتھ سے بہتے پانی کو چاٹ گئی پھر وہ ہرنی کی طرح زقند بھرتی، "ہی! ہی! ہی!" کرتی جنگل کی طرف چلی۔ مشکل سے بنسواڑی سے نکلی ہو گی کہ اس نے ٹھوکر کھائی۔ ایک خاردار درخت میں اُلجھی اور اسی طرح ہنستی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ روح کی چادر رُکتی ہوئی سانس کے کانٹوں میں پھنسی اور ایک جھٹکے میں تار تار ہو گئی!

بقر عیدی پر خون کا مقدمہ چلا۔ دورانِ مقدمہ میں کریم و عدیا کی محبت کی یادگار، ان کا بچہ سُوکھے کے مرض میں گرفتار ہوا اور مر گیا۔

بقر عیدی کو سات برس کی سزا ہو گئی۔

کئے کا بھوگ

کنور اندر بلی سنگھ، ریاست لکھن پور کے ولیعہد تھے۔ اٹھارہ برس کا سن۔ مسیں بھیگتی ہوئی۔ جوان رعنا۔ کھیل کود۔ سیر و شکار کے شوقین چیفس کالج اجمیر کے طالب علم، بچپن ہی سے محلات کے باہر رہنے کے عادی۔ کالج کی دوڑوں اور اچک پھاند میں اوّل آنے والے، یہ سب خوبیاں تھیں بس عیب تھا تو ایک، اور وہ یہ کہ کان کے کچے تھے۔ آج اگر کسی کے دوست ہیں، تو کل اس کے دشمن، جہاں کسی نے کوئی بات دوسرے کے خلاف کان میں ڈال دی۔ انہیں یقین آ گیا اور پرانے آشنا سے بگڑ بیٹھے۔ اب اس کی سنتے تک نہیں۔ اور نہ کسی طرح صفائی ہو سکتی ہے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہ تھا۔ یہ بات ان کو وراثتاً ملی تھی۔ باپ دادا ہمیشہ کے راجا "گہے بہ سلامے برنجند و گہے بدشنامے خلعت دہند"

کے مقولہ پر عمل پیرا۔ یہ بھی اپنے اسلاف ہی کے بیٹے تھے، انہیں بھی طوطا چشمی کرنے میں کا ہے کا عار۔

باوجود اس امر کے، کنور اندر بلی پھر بھی ہم چشموں میں ممتاز تھے۔ اور ریاست کی سوتیلی بہنوں، شراب اور عورت سے اب تک بیگانہ محض تھے۔ بلکہ اس حد تک محترز تھے، کہ ہمسن اور ہم جماعت طلبا اگر دونوں میں سے کسی کی تعریف میں رطب اللسانی فرماتے تو کنور صاحب ان کے مجمع سے اُٹھ کر چلے آتے، وہ اکثر اپنی جگہ پر یہ کہتے سنائی دیتے تھے کہ "میں تو ان لوگوں کی ذہنیتوں سے عاجز ہوں، جب دیکھو اسی طرح کی باتیں ہیں گویا دنیا میں شراب اور عورت کے علاوہ کوئی چیز نہیں!"

کنور صاحب کا اخلاقی اور دماغی ارتقاء ابھی اسی درجہ تک پہونچنے پایا تھا کہ اٹھارواں سال قریب ختم پہونچا۔ اور لکھن پور میں سالگرہ کے جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس تقریب کے لئے یہ بھی کالج سے گھر بلائے گئے۔ وہاں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ سالگرہ کے ساتھ ہی ساتھ رسمِ منگنی بھی ہے۔ اور ان کی شادی ریاست دیبی پور کے راجہ کی لڑکی کے ساتھ طے پاگئی ہے کنور صاحب نے اپنے مجمع میں تو کسی عورت کے شریکِ زندگی بنانے پر بہت کچھ ناک بھوں چڑھائی لیکن مہاراجہ یا مہارانی کے سامنے خاموشی سے سر جھکا لینے کے سوا کچھ بس نہ چلا۔ مہاراج پہلے ان کے قیافہ سے تو یہ سمجھے کہ ان کو یہ رشتہ پسند نہیں لیکن جب انھوں نے، ان کے مصاحبوں سے پوچھنے پر یہ سنا کہ کنور صاحب کو عورت ہی سے نفرت ہے، تو وہ بہت ہنسے۔ ایک خاص انداز سے ایک چھٹے گرگے سے بولے۔ "اچھا تو ذرا اندر کو اس دنیا کی سیر

کرادو۔" اس نے مسکرا کر جھک جھک کر سلام کئے اور "بہت خوب مہاراج!" کہہ کر فکروں میں مشغول ہو گیا۔

جب جوہری اپنے لعل و جواہر بکھیر دے اور خود ہی چوروں اور ڈاکوؤں کو دعوتِ عام دے تو پھر گرد و نظر تیں اگر فائدہ نہ اُٹھائیں تو کیا کریں؟ حقِ نمک کا خیال عین ایمان سہی مگر ایسے وقتوں میں قرینِ عقل نہیں!

یارِ شاطر۔ کے اشارے اور احباب کے اصرار پر رام دلاری نامی دلی والی کنور صاحب کے خاص کمرے میں بلائی ہی گئی۔ ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی پیشواز زیبِ جسم حسن خداداد پہ بناؤ سنگار۔ ہونٹوں پر مسی کی دھڑی۔ آنکھوں میں سرمۂ دنبالہ دار، اٹھتی جوانی رسیلی آواز، دلربا ادائیں، لچکتی کمر، ابھرتا جوبن۔ جب ذرا شوخی سے بھاؤ بتاتی مصاحبین "ہائے وائے" کے نعرے بلند کرتے۔ کنور صاحب چیں بجبیں لیکن دل میں الجھتے ہوئے بیٹھے دیکھا اور سنا کئے۔ گھنٹہ بھر رقص رہا، پھر کنور صاحب انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رقاصہ نے سلام کیا، ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھائے اس نے کچھ شرما کر، گھونگھٹ نکال کر "نظروں کا بان" چلا کر، نوٹ جس ہاتھ سے پائے اسے چوم لیا۔

غیر صنف کے نفسانی مَس میں، جو آتشِ سیال مخفی ہوتی ہے، اس کی ایک لہر سی کنور صاحب کے جسم بھر میں دوڑ گئی۔ ان میں ایک عجیب طرح کا اعصابی تموج پیدا ہو گیا۔ انھوں

نے اس انوکھی کیفیت سے کچھ گھبرا کر، کچھ منفعل، مجمع پر نظر ڈالی اور وہاں سے مضطر، جلدی جلدی دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

رام دلاری ان کو اس نظر سے دیکھتی رہی، جس سے کوئی مشاق شکاری سے بچ نکلنے والے صید کو دیکھتا ہے۔ اس نگاہ میں اس وقت کے داؤں کے خالی جانے کا افسوس بھی تھا، اور آئندہ فتح پانے کی امید کی جھلک بھی تھی۔ مصاحبوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا ایک نے آنکھ ماری، دوسرا مسکرایا، تیسرا ہنس پڑا... لیکن یارِ شاطر، مہابیر ایک ہی گرگِ باراں دیدہ تھا۔ وہ نہ ہنسا نہ مسکرایا۔ نہ رام دلاری سے بولا، بلکہ سیدھے اس کمرے میں پہنچا، جہاں کنور صاحب بھاگ گئے تھے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ اس ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں، جسے رام دلاری نے چوما تھا۔ گویا اس مقام پر اس طرح کی سوزش اور اس عنوان کی ٹیس اٹھ رہی تھی، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو یا ناگن نے ڈس لیا ہو۔

جب انھوں نے مہابیر کو دیکھا تو اس ہاتھ کو شیروانی کی جیب میں چھپا لیا۔ وہ مونچھوں، مونچھوں میں ذرا مسکرایا، اور بہت ہی ادب سے سلام کر کے بولا "چھوٹے مہاراج کیا اُسے یہاں بھیج دیا جائے؟"

کنور صاحب اس سادے سے سوال پر اور گھبرائے۔ برسوں کی صنفِ نازک کی نفرت ایک جانب۔ یہ نئی تکلیف دوسری جانب۔ بیچ میں ان کی قوتِ فیصلہ۔ غریب عجیب کشمکش میں ساکت رہے۔ مہابیر اُلٹے پاؤں پلٹا۔ رام دلاری کو آہستہ سے قریب بلایا۔ کان میں کچھ کہا۔ پھر کنور صاحب کے کمرے میں اسے ڈھکیل کر کواڑ بند کر دیئے وہ

من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم" ہر اشارے سے کہتی داخل ہوئی اور کنور صاحب کے سے ناکردہ کار نئے نویلے خریدار کے ہاتھ بک گئی۔

رام دلاری کو کنور صاحب نے توجو کچھ دیا وہ دیا ہی لیکن خود مہاراج نے، بیٹے کی پہلی شکست پر مسرور ہو کر، مہابیر اور رام دلاری دونوں کو مالا مال کر دیا۔ کئی دن بے حد خوش رہے، اپنے مصاحبین خاص کے مجمع میں اکثر یہ کہہ کہہ کر ہنسی سے بیتاب ہو جاتے تھے: "کنور جی اس جنم میں عورت سے بھاگتے تھے گویا یہ ہم سے بھی نیک ہیں!"
یہ سب تو تھا لیکن مہاراج کو یہ بالکل یاد نہ رہا کہ شکاری جانور کے دانت میں خون لگنا شرط ہے۔ پھر تو خدا کی پناہ۔ کنور صاحب نے ایک ہفتہ مسلسل رام دلاری سے دل بہلایا۔ پھر مہابیر کے ایک رقیب نے ایک دوسرا مال پیش کر دیا۔ پلاؤ قورمہ چھوڑ کر تنجن مزعفر کی طرف جھک پڑے اب تو چاٹ پڑی، ہر طرح کے میوے چکھنے لگے، کبھی باغ گجرات کا کوئی ثمر نوچکیدہ ہوتا، تو کبھی بستان کشمیر کا کوئی گل نورسیدہ۔
غرض کنور صاحب، عورت سے متنفر کنور صاحب، ایک غضب ناک خونخوار جانور تھے، جسے نرم گوشت اور پوست والے شکار کی فکر رہتی، اور ایک منقار دار طائر تھے، جسے ہر چمن میں، ہر طرح کے پھولوں کی جستجو رہتی تھی،
ایک ماہ گھر پر اس طرح کی زندگی بسر کر کے جو کالج پلٹے، تو یاروں نے دو ہی چار گھنٹے کی باتوں میں بھانپ لیا کہ "معصومیت کھو آئے۔ اور اب ان سے بھی کچھ زیادہ ہی

تجربہ کار ہیں۔ پرنسپل اور پروفیسروں کے منشا کے خلاف شہر کی سیر ہونے لگی اور رام دلاری تھوڑے دنوں بعد وہیں آکر جم رہی۔

فطرت نے اپنا کام کیا اور رام دلاری کے پیٹ میں بچہ رہا، اس کی بوڑھی نائکہ تو پیٹ گرا دینے پر مصر تھی، لیکن رام دلاری محض کنور صاحب کے ڈر سے نہ مانی، اور کسی طرح نو مہینے کاٹ گئی، دسویں مہینے بچی پیدا ہوئی، نہایت خوبصورت، نکھ سکھ سے درست نائکہ نے کہا۔ "لو بی بی مبارک اب بڑھاپا بھی چین سے کٹا"۔ رام دلاری چپ ہو گئی اور جب کنور شام کو آئے تو ان سے اس نے شکایتاً یہ بات دُہرائی۔

وہ غصّہ ہو کر بولے۔ "حرامزادی کی ناک ہی کاٹ لوں گا، مری بیٹی، راجپوت کی بیٹی کے متعلق ایسا کہتی ہے"۔

نائکہ کی شامت ہی آجاتی لیکن خیریت یہ گزری کہ اوّل تو وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھی، دوسرے رام دلاری نے انھیں دوسری باتوں میں لگا لیا۔ لیکن افراطِ محبت اور جوشِ ملکیت میں کنور صاحب نے یہ وعدہ کیا کہ وہ دوسرے ہی روز لڑکی کے شانے پر اپنا نام گدوا دیں گے۔ دوسرے ہی دن اس فن کا ماہر بلایا گیا اور اس ننھی سی جان کے بازو پر "آئی بی" اندر بل کے انگریزی مقطعات گود دیئے گئے۔

ادھر یہ تو احباب کو جلسہ دینے کی تیاری میں مشغول تھے، اُدھر پرنسپل نے سارے حالات مہاراج کو لکھ کر بھیجے، اور ان سے تاکید کی کہ کنور صاحب کو جلد سے جلد لکھن پور میں بلا لیا جائے۔ تیسرے ہی دن کنور صاحب کو حکم ملا کہ ریاست آؤ۔ رام دلاری سے بہت

سے وعدے کر کے گھر پہونچے۔ وہاں مہاراج کئی دن بولے تک نہیں اور مہارانی نے بڑی نصیحت کی جب یہ بھی ملول و غمگین دکھائی دیئے تو مہابیر کے ذریعہ وہ انھیں بلا دی گئیں۔ رام دلاری کے پاس تھوڑا سا روپیہ بھجوا دیا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ کنور صاحب سے کسی طرح ملنے ملانے یا پرانے تعلقات کو قائم رکھنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کرے۔"

وہ بیٹی کو حسرت سے دیکھ کر، تھوڑا سا روئی۔ پھر نائکہ کی کہی ہوئی بات یاد کر کے تھوڑا سا مسکرائی۔ پھر آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر بڑے زور سے ہنس پڑی!

پندرہ برس بعد اندر بلی سنگھ، دلی وائسرائے سے ملنے آئے، تو خیر سے مہاراج بھی ہو چکے تھے، شراب بھی پینے لگے تھے۔ اور عیاشی کے لیے خاص مصاحبین بھی ساتھ لائے تھے۔ انھیں میں سے ایک مصاحب نے شہر سے پلٹ کر، ایک غنچۂ ناشگفتہ کی تعریف کی "مہاراج اس شہر میں ایک مال ہے رام کنور نامی، سارا شہر اس کے گانے کا معترف اور اس کے حسن کا دیوانہ ہے، برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن! دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کلیجہ میں رکھ لو! بس، سرکار! کیا عرض کیا جائے کیا چیز ہے!" غرض اس چرب زبانی سے اس کی مدح سرائی کی کہ مہاراج کے منہ میں پانی بھر آیا۔ حکم دیا "بلاؤ اور فوراً بلاؤ، جتنا مانگے اتنا دو۔ پہلے مجرا ہوئے ہم بھی دیکھ بھال لیں، تو اور باتیں بھی طے ہوں۔"

بی رام کنور آئیں۔ جتنی تعریف کی گئی تھی، کچھ اس سے بھی سوا نکلیں۔ بوٹا سا قد، گول بدن، پتلی کمر، صبیح و ملیح رنگ، غزالیں آنکھیں، ہلالی ابرو، گلاب کے پھول سے گال، پتلے

یا قوتی ہونٹ۔ غرض ہر عضو دل میں کھبا جاتا تھا۔ مہاراج دیکھتے ہی جھومنے لگے۔ بے ایک گھونٹ پیئے دو بوتلوں کا نشہ آنکھوں سے ظاہر ہونے لگا۔ ادھر ساز پر ہاتھ پڑا اور گلا ملایا جانے لگا، ادھر یہ لڑکھڑاتے اُٹھے اور رام کنور کی بغل میں جاکر بیٹھ گئے۔ وہ گھبرائی لیکن گائے گئی، ابھی اچھی طرح گا بھی نہ چکی تھی کہ انھوں نے نائکہ کی طرف دیکھ کر پوچھا "آج کی رات ہماری... کتنا؟" وہ بولی "سرکار! ایک لاکھ نقد اور پانچ سو مہینہ!" انھوں نے کہا۔ خزانچی سے دلوادو" اور رام کنور کو گود میں اُٹھائے کمرے میں لیکر بھاگ گئے۔......

....

صبح تڑکے رام کنور ابھی سو رہی تھی کہ مہاراج اٹھے اور اس محو ناز کو سر سے پاؤں تک جی بھر کے دیکھنے کے لئے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ بال چھٹکے ہوئے تمام تکیہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ گردن ذرا ایک جانب کو جھکی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا دہانہ کھلا ہوا تھا۔ گلے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ انگیا مسک گئی تھی، اور...... اور...... کہ اتنے میں ان کی نظر داہنے شانے پر جا پڑی تو دیکھا کہ کچھ گدا ہوا ہے۔ غور سے پڑھا "آئی، بی" لکھا تھا۔ آنکھیں مل ڈالیں پھر وہی مقطعات دکھائی دیئے۔ تھر تھر کانپنے لگے۔ اسے جلد سے جلد جگایا۔ وہ ناز سے "اُنھ، اب نہ چھیڑو!" کہہ کر کروٹ لینے لگی۔ اُنھوں نے زور سے جھنجھوڑ دیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ انھوں نے انگلی سے وہ الفاظ دکھلا کر پوچھا "اس۔ س۔ کے۔ ک۔ ک۔ کیا معنی؟"

وہ بے پروائی سے بولی "تمھیں یہ آخر ہوا کیا ہے؟ اماں نے مرتے وقت بتایا تھا

کہ یہ مرے باپ کے نام کے حرف ہیں!"

مہاراجہ وہاں سے اُٹھے۔ لڑکھڑاتے، گرتے پڑتے بکس کے پاس پہنچے۔ اسے کھولا۔ اس میں سے ریوالور نکالا۔ دو کارتوس رکھے، پلنگ کے پاس آئے۔ رام کنور اب تو انھیں خوف زدہ آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر عجیب بھیانک آواز سے کہا "ارے تو جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟ میں ہی ترا باپ ہوں!"

رام کنور کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ آہستہ آہستہ جھومنے لگی۔ اس انداز سے جیسے اس کی آنکھوں میں ساری دنیا گھوم رہی ہو، اس کے بعد اس نے مہاراجہ کو سر سے پاؤں تک ایک نظر دیکھا اور اس کا حسین چہرہ نفرت سے حد درجہ کریہہ اور بدصورت بن گیا۔ اس طرح کا خوفناک کہ مہاراجہ ڈر سے کانپنے لگے...... ابھی یہ کانپ ہی رہے تھے کہ وہ شیرنی کی طرح جھپٹی اور ان کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر اس نے ان کے سینے پر فیر کر دیا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑا اور مسہری پر گر پڑے۔ فیر کرتے ہی رام کنور کا چہرہ بدلا۔ نفرت کی جگہ محبت تھی۔ لیکن فضا ہی محبت کی نہ تھی۔ بیٹی اور معشوقہ کی جگہ! اب باپ عاشق باپ کے چہرے پر حقارت و غصہ کے آثار تھے وہ رک رک کر بولے "کیا تو...... اب...... اپنی...... جان...... بچا...... لے گی؟"

رام کنور کا چہرہ پھر بدلا۔ اس نے زہرخندہ کر کے کہا "نہیں میری رگوں میں بھی راجپوت خون ہے!" یہ کہتے کہتے اس نے نال اپنے سینے کی طرف پھیری گھوڑا

گرادیا۔ آواز ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ سسکتے ہوئے باپ کے قدموں کے پاس
گر کر دم توڑنے لگی!

بجھتا ہوا چراغ بھڑک اٹھا۔ مہاراج کی آنکھوں میں آخری چمک پیدا ہوئی۔
انھوں نے رُک رُک کہا" بھگوان۔۔۔۔۔ شکر ہے! مجھے میرے۔۔۔۔ کیے کا بھوگ
۔۔۔۔۔۔ اسی جنم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ مل گیا!

عدالت

شوکت حسین کا عنفوانِ شباب تھا۔ ہاتھ پاؤں میں قوت تھی۔ خون میں حرارت تھی اور کالج کے رنگین مزاج لڑکوں کی صحبت۔ جہاں انھوں نے انگریزی پڑھی۔ فارسی پڑھی۔ ریاضی پڑھی منطق پڑھی۔ وہیں انھوں نے چشم و ابرو کی زبان۔ دل و جگر کے افسانے اور عورت کے جنسی معنی بھی اچھی طرح سمجھ اور پڑھ لئے فیشن کے لئے روپیہ تھا۔ گانے کے لئے اچھی آواز تھی اور پڑھنے کے لئے واسوختِ امانت، اور رینالڈس کے ناول! اعصابی ہیجان نہ ہو تو کیونکر؟ ہر وقت یہی تذکرے، ہر آن یہی فکر۔ اور ہر لمحہ اسی طرح کے احباب کی صحبت۔ پھر لطف یہ کہ احسان نگر کے سب سے بڑے زمیندار کے لڑکے تھے۔ شہر میں اگر پیسوں کی ضرورت پڑتی تو دیہات میں محض اشاروں

ہی کی!

شوکت حسین کے شکاروں میں تین طرح کی نبات النعش تھیں۔ کچھ تو وہ جنہیں اعصاب مجبور کرتے۔ کچھ وہ جنہیں تنگیٔ معاش مجبور کرتی اور کچھ وہ جنہیں اعضائے رئیسہ کا سردار دل مجبور کرتا۔

کالج کے پڑوس میں دو ایک عاشق تن مہ جبینیں ملیں۔ جنہوں نے اس طرح کے جوان رعنا کے شباب سے لذت یاب نہ ہونا خود گناہ سمجھا۔ تھوڑی دور ہٹ کر کوٹھوں پر ایسی حسن فروش ہستیاں دستیاب ہوئیں جنہوں نے اس کی دولت سے متمتع ہونا اپنا فرضِ عین جانا۔ مگر احسان نگر کی سادہ مزاج دیہاتنوں نے "شوکت میاں" کے محض چوڑے چکلے سینے، نشیلی انکھڑیوں اور میٹھی میٹھی باتوں پر بے قابو ہو کر تن من کی نذر چڑھا دی۔ گاؤں کی رہنے والیاں، چھل کپٹ سے ناواقف۔ رات دن، اندر باہر زمیندار کے ہاں کام کرنے آتی۔ ان کی موہنی صورت دیکھتی انھیں آہستہ آہستہ گنگناتے سنتی اور ان کی شہری اداؤں پر دل کھو بیٹھتی تھیں۔ وہ ان کے تمتماتے ہوئے چہرے دیکھتے، شہر کے حاصل شدہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے، اپنی، نہ فنا ہونے والی محبت کا یقین دلاتے اور نذر قبول کر کے پوجارن کو ٹھکرا دیتے۔

اسی لئے احسان نگر کے اس طبقہ میں، جسے دنیا "ارذال" کہتی ہے، ٹوٹے ہوئے دلوں کا ایک انبار تھا اور ان کا باعث محمد حسین زمیندار کا یہ اکلوتا بیٹا۔ دیہاتنیں جب مردود بارگاہ ہوتیں، تو گونگی بن جاتی تھیں، انھیں دیکھ کر کلیجہ مسوستا۔ دل ہی دل

ہوتا گئے کا پچھتاوا ہوتا، دیوتا کے شقی القلب ہونے کا یقین آتا، لیکن سینے پر صبر کا بھاری سل رکھ لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ چڑیا کھیت چگ چکی تھی۔ فریاد کرنے سے کیا حاصل ہوتا؟ عصمت و بے عصمتی میں جو دیوار چین حائل ہے اس کی یہ خصوصیت ہے کہ با حیا عورتیں اسے پار کرتے ہی منہ بند کر لیتی ہیں اور زبان سی لیتی ہیں۔ دل میں خواہ کتنی ہی گھٹیں، مگر ساری عمر صرف اسی فکر میں کٹتی ہے کہ کہیں راز افشا نہ ہو جائے۔ کہیں کوئی سن نہ پائے۔ کہیں کسی کو شک و شبہ نہ ہو جائے، اسی لئے صیاد سے زیادہ حمیدہ کو خود ہی اخفا کی فکر رہتی تھی اور شوکت حسین کے بزرگ ان کی حرکتوں سے بالکل لاعلم رہتے تھے۔

مگر جب چور، چوری میں ایک زمانہ تک نہ پکڑا جائے، تو حوصلہ بڑھتا ہے ہمت زیادہ ہوتی ہے۔ اور دل کو یقین آجاتا ہے کہ ہم سا شاطر کوئی دوسرا نہیں۔ سب کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہمارے لئے ودیعت ہوا ہے۔ اسی وجہ سے احتیاط میں کمی اور بے پروائی میں زیادتی ہونے لگتی ہے۔ ضمیر بھی آہستہ آہستہ گناہ کا عادی ہو جاتا ہے اور شقاوت بڑھنے لگتی ہے، یہی حالت چوری چھپے کی بدمعاشیوں کی ہے۔ پہلے دو ایک بھروسا کرنے والے دلوں کو دھوکا دینے پر ضمیر ٹوکتا ہے۔ جب اس کی نہیں سنی جاتی ہے تو پھر کوئی آہ و فریاد کرے لیکن اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ وہ اطمینان کی چادر سر سے پاؤں تک اوڑھے پڑا خراٹے لیا کرتا ہے۔

شوکت حسین نے اتنے شیشہ ہائے دل کچلے اور روندے تھے کہ نہ اب تلوے فگار ہوتے تھے، اور نہ انھیں کسی کو ٹھوکر مار دینے میں کسی طرح کی جھجھک ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھنے

لگے بھئے کہ رعایا، پرجا کا جس طرح یہ فرض ہے کہ وہ زمیندار کی خدمت کرے، بیگار دے، نذر چڑھلائے اسی طرح اس پہ یہ بھی لازم ہے کہ وہ زمیندار کے جوان لڑکے کے لئے اپنی بہو بیٹیاں معاف کر دے۔ آخر اس میں ان کا جاتا ہی کیا ہے؟ ان کی کچھ نردیں تو ہونے والے زمیندار کے پہلو بہ پہلو بیٹھ لیتی ہیں جس کے چرن چھونا وثنوں سے نصیب ہوتا ہے' اس کے بازو پہ ان کی زلفیں تو پریشان ہو لیتی ہیں! کیا یہ رتبہ کچھ کم ہے؟ کیا یہ عزت تھوڑی ہے؟ اور اگر۔۔۔ اگر اس رشتہ کی یادگار بھی کوئی باقی رہ گئی تو پھر تو زمیندار کا خون ان کی رگوں میں پہونچ جاتا ہے۔ گویا بھنگی کے گھر بھگوان نے جنم لیا!

جب اس طرح کے خیالات دماغ میں ہوں' اور نفس رانی کی خواہش دل میں' پھر بھی بدلیا جو لاہن' دور دور چھٹکی پھرے' یہ کیسے ممکن تھا۔ شوکت حسین کو ممکن تھا کاوش نہ ہوتی، لیکن ایک تو پندرہ برس کا سن۔ پھر شوخ چنچل۔ اس پہ غضب کی ملیح بھپکا۔ شلجم ممکن ہے نہ بھا دے، لیکن چٹ پٹی چیز سامنے تو بار! دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ پھندے ڈالنا شروع کر دیئے۔ آنکھیں لڑائیں۔ ٹھنڈی سانسیں بھریں، روپیہ دکھایا' لیکن اس نے ناک سکوڑ کے سر ملا دیا۔ اب تو پرانے شکاری کو صید افگنی میں مزہ آنے لگا، چیز تو وہی ہے' جو مشکل سے ہاتھ آئے۔ اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ چنانچہ مہینوں فکر رہی۔ بار بار کوششیں کیں۔ متعدد حیلے تراشے۔ لیکن وہ چھلاوا تھی آسانی سے

دام ہیں نہ آئی۔ اب تو واقعی دل پراگندہ ہوا۔ سچ مچ بیمار ہو گئے۔ آخر بدلیا بھی عورت تھی، جوان تھی، جاہل تھی، پرجا تھی، پتھر سا دل پسیجنا شروع ہو گیا۔ اگر باپ نے گونا کر کے سسرال بھیج دیا ہوتا تو شاید ماحول کا انقلاب خیالات بدل دیتا۔ لیکن احسان نگر کا قیام، ہمجنسوں کے قصے۔ زمیندار کا رعب و جلال، پھر شوکت حسین کا گاؤں بھر میں حسین ترین جوان ہونا۔ یہ سب اثر کرنے لگا۔ جتنی سخت مدافعت کی تھی، اتنی ہی سخت شکست بھی ہوئی۔ وہ گری اور بری طرح گری۔ نہ ناموس کا پاس تھا، نہ عزت و نام کا، شوکت حسین کے پیچھے اس نے سب کچھ تج دیا، وہ اپنے پیار سے میں غرق ہو گئی۔ اس طرف بھی بڑی کوششوں کے بعد کامیاب ہونے نے انھیں ایک حد تک گم کر دیا اور ایک زمانہ تک یہ بھی کھو گئے۔

دفعتاً باپ کی نگاہ تند اور لال چہرے نے چونکا دیا۔ سرشاری، رسوائی اور بدنامی کی حد تک کھینچ لائی تھی۔ ہوش آتے ہی پرانے دستور کے مطابق مٹی کا سکورا ٹھکرا دیا گیا۔ شراب اس کی آخری حد تک پی لی تھی، اب ساغر گل کی ضرورت؟ وہ توڑنے اور پھینکنے کی چیز ہی تھی! کچھ سونے چاندی کا کاسہ تھوڑے تھا کہ کلیجہ سے لگا رکھا جاتا! مگر پینے والا جو کچھ سمجھے، جام خود کو ذلیل سمجھنے سے رہا۔ وہ تو اپنے کو جام جمشید ہی سمجھتا ہے!

بدلیا نے جب بدلے ہوئے رنگ کو محسوس کیا، تو وہ دیوانہ وار شوکت حسین کی ماں کے پاس گھس گئی۔ زمیندارن نے اس کی صورت دیکھتے ہی ماماؤں کو حکم دیا، نکالو

باجی کو یہاں سے ! مالزادی نے میرے بچے کو خراب کر دیا" اب کیا تھا، ہر ایک جوتیاں لیکر دوڑی۔ وہ گھبرا کر بھاگی۔ اور اس طرح بھاگی کہ زمیندار کے گھر سے ہی نہ نکلی، بلکہ اپنے گھر سے بھی نکل گئی اور گاؤں سے بھی ! ناگن چوٹ کھا کر پلٹی نہیں

ناگن چوٹ کھا کر پلٹی نہیں بلکہ بھاگ گئی تھی۔ خدا جانے کہاں کس جنگل میں کون سے سوراخ میں جا کر چھپ رہی کہ ماں باپ نے ڈھونڈھا۔ برادری اور گاؤں کے لوگوں نے ڈھونڈھا مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ گاؤں میں ہر شخص کہتا "مر گئی۔ جان دے دی" اس کے ماں باپ خفا بھی ہوئے، روئے بھی۔ گاؤں کے لوگوں نے افسوس بھی کیا، اور ہمدردی بھی کی۔ لیکن، شوکت حسین صرف شہر چلے آئے۔ ضرورت تھی کہ ان کے ماں باپ کے غصہ کو فرو ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس لیے آنکھ سے اوجھل ہی رہنا ابھی بہتر تھا۔ رہا بدلیا کا خیال، اور ان کے دل میں! توبہ کیجیے! اُتاری ہوئی پاپوش تھی! گم ہو گئی ہو جانے جب استعمال کے قابل تھی، انہوں نے استعمال کر لیا۔ اب ان کی جوتیوں کو غرض؟ انھیں یہ معلوم تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ننھی جان بھی ہے، جو انھیں کا عطیہ ہے لیکن یہ سب تو ہوا ہی کرتا ہے، کون سی نئی بات تھی" ارذال" تو "اشراف" کا برتن ہی ہیں، جب تک جی چاہا ان میں مزعفر پکتا اور کھایا جاتا رہا، جب جی بھر گیا ان کو یونہی جوٹھا چھوڑ دیا۔ اب اگر انھیں کتے چاٹیں تو اپنی بلا سے!

بیس برس کا زمانہ گذر چکا تھا۔ ماں باپ بھی مر چکے تھے۔ شادی بیاہ بھی ہو چکا تھا

زمینداری کے ساتھ ساتھ ڈپٹی کلکٹری بھی مل چکی تھی۔ اعزاز بھی تھا، ثروت بھی تھی۔ ہاں ایک بات نہ تھی۔ خوشی! اور وہ اس لئے کہ صرف ایک لڑکا پیدا ہوا، اور پیدا ہونے کے پندرھویں دن غائب ہوگیا۔ بیوی پر اس غم کا یہ اثر پڑا کہ وہ قریب قریب دیوانی ہوگئیں۔ دن میں کئی کئی بار اختلاج ہوتا۔ کبھی ہنستیں کبھی روتیں۔ کبھی ان سے جھگڑتیں۔ کبھی خوشامد کرتیں۔ مگر اس روز سے آج تک اس طرح گھبراتیں اور ڈرتیں۔ جیسے ساری آفتیں انہیں کی لائی ہوئی تھیں۔ یہ بھی اپنے پرانے طرزِ عمل پر کاربند رہے۔ مختلف عورتوں سے دل بہلاتے رہے۔ دن بھر کچہری میں ہوتے اور رات کو کسی مہوش کے پہلو میں، لیکن جیسے جیسے سن بڑھتا جاتا تھا۔ اعضا کمزور ہوتے جاتے تھے، مرنے کا دن قریب آتا جاتا تھا، اتنا ہی دل میں خلا بڑھتا جاتا تھا۔ محسوس ہوتا کوئی چیز کم ہے، کوئی شے گم ہے۔ اس کی جگہ نہیں پر ہوتی، اس کی تمنا اس کی خواہش بڑھتی ہی جاتی ہے اور دل ناسور کی طرح ٹپکنے لگتا۔

یہی وجہ تھی کہ درد کے چھپانے کے لئے درشت کلامی بڑھا دی تھی۔ سختی زیادہ کردی تھی۔ پولیس کے اشارے پر سزا دیتے تھے، بلکہ محض بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ جہاں کسی کے خلاف رپورٹ ہوئی اور انھیں ذرا بھی شبہ ہوا، انھوں نے اس جرم کی سزا دے دی۔ وہ اسی لئے اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ سنگ دل اور سخت مشہور تھے۔

ایک روز پولیس والے ایک نوجوان بنجارے کو پکڑ لائے۔ بیان لیا گیا، معلوم ہوا کہ رات بارہ بجے یہ شہر میں گھوم رہا تھا جب پولیس والوں نے ٹوکا، تو اس نے بھاگنے کی

کوشش کی۔شبہ پر گرفتار کر لیا گیا۔صبح کو کئی محلّوں سے خبر آئی کہ رات میں کئی وارداتیں ہوئیں۔بظاہر اسی کی حرکت تھی۔ڈپٹی صاحب کے لئے اتنا کافی تھا۔بنجارہ بیچارا ایک بدنام قوم کی فرد تھا۔اس کا کوئی جاننے والا پہچاننے والا نہ تھا۔وہ لاکھ اپنی معصومیت اور بے گناہی کی قسمیں کھاتا رہا، لیکن یہ دل میں طے کر کے اٹھے کہ دو برس سے کم سزا نہ دوں گا۔

گھر پہونچکر چائے پی رہے تھے کہ معلوم ہؤا کہ ایک عورت ملنے آئی ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے۔پیشانی پر شکن پڑ گئی۔"کہاں کی ہے کیوں آئی ہے۔کس عمر کی ہے؟" چپراسی سے خفا ہو کر پوچھنے لگے۔پھر قبل اس کے وہ کوئی جواب دے سکے خود ہی بولے۔"اچھا بلاؤ"

ایک پینتیس چھتیس برس کی ادھیڑ عورت، گھونگھٹ نکالے، سامنے آکر کھڑی ہوگئی یہ بغور دیکھتے رہے، لیکن گھونگھٹ سے چہرہ ڈھکا رہا۔بالآخر ترشروئی سے بولے "تو کون ہے، کیا چاہتی ہے؟"

عورت نے گھونگھٹ الٹ دیا۔ڈپٹی صاحب بےساختہ بول اُٹھے۔"بدلیا!" وہ ذرا مسکرائی۔"جی ہاں بدلیا" انہوں نے چپراسی کو ہاتھ سے اشارہ کیا، وہ کواڑ بند کر کے چپکے سے باہر چلا گیا۔ڈپٹی صاحب نے پھر بدلیا کو بغور دیکھا۔واقعی عجیب ملیح صورت پائی تھی۔عجب دلربا نقشہ تھا۔عجب سڈول جسم تھا۔بیس برس میں اگر کوئی فرق ہؤا تھا، تو صرف اتنا کہ اس زمانے میں وہ ناکردہ کار چھوکری تھی۔ہاتھ پاؤں نرم نرم، بالکل نازک نازک تھے۔اب چہرے پر متانت تھی۔اور کھڑے ہونے کا انداز بتاتا تھا کہ جسم میں بھول

کی سی نزاکت کی جگہ، بید کی سی لچک نے لے لی ہے۔ للچائی ہوئی نگاہیں پڑنے لگیں،
اور اپنے مینجے ہوئے انداز میں بولے " بہت دنوں کے بعد یاد کیا۔ پھر بھی شکریہ!"

بدلیا نے پھر انھیں دیکھا اور مسکرائی، مگر بالکل اسی انداز سے جس انداز سے کوئی بلی
اپنے پنجے میں چوہے کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس مسکراہٹ نے ان کے دل پر بجلیاں گرادیں
وہ یکبارگی اُٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بولی۔
"میں ڈپٹی صاحب کے پاس آئی ہوں، شوکت میاں کے پاس نہیں!" انہوں نے کہا " اُونہہ
باتیں نہ بناؤ۔ آؤ کلیجے سے لگ جاؤ۔" وہ پھر مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ میں ہزاروں وشنے
پنہاں تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ اس نے کہا۔ جو بنجارا آج آپ کے سامنے
پیش کیا گیا ہے اُسے چھوڑ دیجئے۔" وہ ہنسے اور بولے۔" کیوں؟ اُس جوان سے دل اٹکا ہے؟"
بدلیا کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ وہ ایک قدم ان کی طرف بڑھی۔ انہوں نے پھر آغوش میں
کھینچنے کے لئے ہاتھ پھیلایا، اس نے ہاتھ جھٹک دیا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر
بولی۔" جی نہیں وہ مرا لڑکا ہے!"

اب تک شوکت حسین کی طرح باتیں تھیں۔ اب مجسم ڈپٹی صاحب تھے، ایک مجرم
کی ماں ان کو قانون کے خلاف ترغیب دے رہی تھی۔ ساری سختیاں دفعتہ چہرہ اور انداز
میں نمایاں ہوگئیں۔ کرسی پہ بیٹھ گئے اور بولے " ہوں وہ تمہارا لڑکا ہے؟"

اس نے کہا۔" جی ہاں مرا لڑکا ہے اور بالکل بے قصور!"

ڈپٹی صاحب ہنسے۔ سب ہمیشہ یہی کہتے ہیں بھلا بنجارا اور چور نہ ہو۔ بولے " اچھا تو

اصلی چور کہاں ہے؟" اب کی بار بدلیا ہنسی۔ بولی "کیا اگر اصلی چور پکڑ وا دیا جائے تو
مرا بیٹا چھوٹ جائے گا" بولے "یقینی۔ یقینی!"

اس نے کہا "تو اس کے لئے حضور کو زحمت کرنا پڑے گی" بولے "وہ کیا؟"
کہنے لگی "حضور آج بارہ بجے کے بعد مرے ساتھ چلیں میں چور کو گرفتار کرادوں گی"
شبہات پیدا ہونے لگے کہ عورت کہیں دھوکا تو نہیں دے گی۔ چوروں کے ہاتھوں قتل
تو نہ کرا دے گی۔ وہ چہرے سے ان کے شبہ اور خوف کو سمجھ کر بولی "ڈر معلوم ہوتا ہے؟
شاید میرے لئے یا میرے ساتھ کبھی بارہ بجے رات کے بعد گھر سے نہیں نکلے میں چوروں
میں پھنسا دوں گی! کیوں؟"

غیرت آگئی بولے "اچھا میں تنہا چلوں گا لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس دو ریوالور
ہوں گے۔ اگر ذرا سا شک ہوا تو میں سب سے پہلے تم ہی کو ختم کر دونگا"

وہ بیساختہ ہنس پڑی اور بولی "ابھی میرے مرنے کے دن نہیں آئے۔۔۔۔
بارہ بجے رات کو آپ کے بنگلے کے دروازے پر ملوں گی" پھر گھونگھٹ نکال کر کمرے
سے باہر چلی گئی۔

بارہ بجے رات کو ڈپٹی صاحب نے برجس پہنی شکاری کوٹ پہنا، پیٹی کسی اور دو
ریوالور کمر میں لگائے۔ پھر ٹارچ اٹھالی اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں بنگلے سے باہر نکلے
دروازہ پر بدلیا کھڑی تھی۔ اس نے گھونگھٹ ہٹا کر ان کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر

پوچھا "ڈر نہیں معلوم ہوتا؟" انہوں نے ٹارچ روشن کر کے دونوں ریوالور دکھائے۔
وہ عجیب ترنم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ انھیں غصہ آگیا اور ڈانٹ کر بولے "چلو چور کو
گرفتار کراؤ۔ پھر ہنس لینا!" اس نے ہنسی روک کر انھیں پھر دیکھا اور بولی "بہت خوب"

دسمبر کی اندھیری رات تھی، اور ہوا تیز چل رہی تھی، اکثر بدلیا کی ساری ہی اس
طرح بھر جاتی کہ چند ہی قدم کے فاصلے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کالی دیونی ہے
پھر راستہ بھی، پیچ در پیچ، اور تنگ و تاریک تھا۔ گلیاں اس طرح ناہموار تھیں کہ بار بار
ٹارچ روشن کرنا پڑتی تھی۔ غرض ٹھوکریں کھاتے، دونوں کوئی آدھ گھنٹہ تک خاموش
چلتے رہے۔ پھر بدلیا نے دفعتہً رک کر کہا "بہت دبے پاؤں آئیے۔ اب ہم لوگ
قریب ہی ہیں" چند قدم آگے چلنے کے بعد وہ پھر رک کر قریب آئی، اور بولی "دیکھئے وہ
سامنے داہنے ہاتھ کی جانب بیٹھا چور دیوار کاٹ رہا ہے" انہوں نے آنکھوں پر زور
دیا۔ وہاں چاروں طرف گلی سے زیادہ تاریکی معلوم ہوئی، آہستہ آہستہ اور قریب آئے۔
چور اپنے کام میں لگا ہوا تھا، نہایت پھرتی اور صفائی سے ایک کے بعد ایک اینٹ
ہٹاتا جاتا تھا۔ جب یہ کوئی دس قدم پر رہ گئے تو انہوں نے ایک ہاتھ میں ٹارچ لیکر
اس کا بٹن دبا دیا اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور لے کر کہا "اگر ایک انچ بھی تم ہٹے تو
میں گولی مار دوں گا" چور اچک پڑا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی کے پاؤں کے نیچے دفعتاً
انگارہ پڑ جائے۔ روشنی میں اس کی آنکھیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں۔ یہی انیس
بیس برس کا تھا مگر سُتا ہوا چہرہ اور کانپتے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ جرائم کے کرنے میں

ابھی وہ سنگدلی اور سختی نہیں آئی تھی جو پیشہ ور مجرموں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ڈپٹی صاحب آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے، انہوں نے اس کے سینے سے ریوالور لگا دیا۔ پھر بدلیا سے مڑ کر وہ بولے۔" دیکھو مری جیب میں ہتھکڑی ہے اسے پہنا دو!" وہ قریب آئی، لیکن جیسے ہی ٹارچ کی روشنی میں چور نے اسے دیکھا۔وہ بیساختہ پکار اُٹھا" ماں!" ڈپٹی صاحب ذرا سا جھجھک کر پیچھے ہٹے اور مسکرا کر بولے۔" یہ دوسرا ابھی!" بدلیا نے نہایت اطمینان سے ان کی جیب سے ہتھکڑی نکالی، اور اس کانپتے ہوئے نوجوان کے ہاتھوں میں پہنا دیں۔وہ کہتا رہا۔" ماں خدا کے واسطے! ماں ہاتھ جوڑتا ہوں! ماں یہ کیا کر رہی ہو؟" لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔جیسے اس نے سنا ہی نہیں جب ہتھکڑی لگا چکی تو ڈپٹی صاحب کی طرف پلٹ کر بولی۔" کیوں حضور اب ہنسوں؟ اب تو چور گرفتار ہو گیا"

ڈپٹی صاحب نے جھلاہٹ میں کچھ جواب نہ دیا۔چور نے پھر کہا۔" ماں۔ماں خدا کے واسطے!" وہ دفعتاً پلٹ پڑی۔" کیا ماں ماں کی رٹ لگائی ہے! اب باپ باپ کہہ! دیکھ یہ تیرے باپ کھڑے ہیں، جنہوں نے تیرے ہاتھ میں ہتھکڑی بھروائی ہے۔جو تیرے سینے سے ریوالور لگائے کھڑے ہیں! میں تیری ماں نہیں۔تیری ماں ان کے بنگلے میں ہے۔ وہی جو میری دعاؤں سے سٹرن ہو گئی ہیں سٹرن!" اور وہ دفعتاً ہنسنے لگی۔ڈپٹی صاحب تھر تھر کانپ رہے تھے۔چور ہاتھ میں ہتھکڑی پہنے ان کے قدموں پر گرا ہوا تھا لیکن وہ ہنس رہی تھی۔ڈپٹی صاحب نے دفعتہً طیش میں آ کر ریوالور پیٹی میں کھونس لیا اور ایک طمانچہ اس کے منہ پر مارا۔وہ اس اچانک حملہ سے لڑکھڑا گئی۔اگر دیوار قریب نہ ہوتی

تو شاید گر پڑتی۔ پھر ایک بار ان کی طرف گھور کر بولی " بُرا معلوم ہوتا ہے۔ آج جو تمہارے سامنے عدالت میں پیش ہوا تھا۔ وہ تمہارا وہ لڑکا ہے جو میرے پیٹ سے پیدا ہوا تھا یہ تمہارا وہ لڑکا ہے جو تمہاری سٹرن کے پیٹ سے ہے۔ میں ہی چرا لے گئی تھی اور اسی دن کے لئے چرا لے گئی تھی۔ یہی دیکھنے کے لئے کہ دونوں کو ایک ہی طرح کی تربیت دی جائے تو فرق ہوتا ہے کہ نہیں۔ وہ رذیل بچہ ہے۔ یہ شریف زادہ ہے۔ فرق ہونا چاہیئے تھا مگر دونوں ویسے ہی نکلے تم ڈپٹی ہو۔ انصاف کرتے ہو۔ قانون پر عمل کرتے ہو۔ لے جاؤ دیکھو قانون میں انصاف ہے کہ نہیں۔ کہ وہاں بھی شریف و رذیل کا فرق ہے۔ ایک کے لئے ذلّت اور دوسرے کے واسطے عزّت!"

ڈپٹی صاحب نے کہا "جھوٹ! غلط! بہتان!"

وہ پھر ہنسی " اچھا۔ اچھا دیکھو تمہارے ایک مہینہ کے بچّے کے سینے پر دو بڑے بڑے سیاہ تل تھے۔ ٹارچ سے بغور دیکھو۔ اس کے سینے پر وہی تل ہیں کہ نہیں؟" یہ کہتے کہتے اس نے چور کی قمیص پھاڑ ڈالی۔ گردن کی ہنسلی کے نیچے سینہ پہ دو بڑے بڑے سیاہ تل، زرد و زرد جسم پر بہت نمایاں طور پہ دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ڈپٹی صاحب کی دونوں ٹانگیں کسی نے کاٹ دیں۔ وہ بھد سے زمین پر گر پڑے۔ بدلیا نے زور کا قہقہہ لگایا، اس قہقہے میں نہ معلوم کیا اثر تھا کہ ڈپٹی صاحب کا چہرہ جو غم سے زرد پڑ گیا تھا، دفعتہً غصّہ سے تاریک ہو گیا۔

انہوں نے ریوالور سیدھا کیا اور بدلیا پہ فیر کر دیا۔ گولی سینہ کے پار ہو گئی اس نے

دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑا۔ لڑکھڑائی اور ان کے قدموں کے پاس منہ کے بل گر پڑی۔
گلی میں گولی کی آواز ہزار گونی زیادہ معلوم ہوئی۔

ڈپٹی صاحب نے گھبرا کر جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھا۔ صرف منٹوں کا معاملہ تھا،
پولیس یقینی .... آتی ہوگی۔ بیٹا اسی طرح ہتھکڑی بھرے ہاتھ
جوڑے سامنے تھا۔ جلدی سے جیب سے کنجی نکال کر ہتھکڑی کھول دی۔ پھر کہا "بھاگ
جاؤ! جلدی!"

وہ مشکل سے گلی سے نکلا ہوگا کہ دوسرے فیر کی آواز سنائی دی ——

—— مدعی و مدعا علیہ سب سے بڑی عدالت کے سامنے پیش تھے!

آم کا پھل

ساون کا مہینہ تھا۔ کالی کالی گھٹائیں جھوم جھوم کے اٹھتی اور ٹوٹ ٹوٹ کے برستی تھیں۔ ٹھاکر صاحب کے آموں کے باغ میں ٹپکا لگا تھا۔ لڑکے لڑکیاں اسی تاک میں رہتے کہ رحیمن کھٹک کی آنکھ بچے اور آم لے اُڑیں۔ مگر وہ بھی ستر بہتر ہونے پر بھی اتنا ٹانٹھا تھا کہ اپنے یک پلیا چھوٹے چھپر میں بیٹھا، وہ ڈانٹ بتاتا کہ لونڈوں کے اوسان خطا ہوتے تھے اور ان کو بھاگتے ہی بن پڑتی تھی۔ اگر کوئی لڑکا کسی طرح اس کی آنکھیں بچا کر ایک آدھ زمین پر پڑے ہوئے پھل اُٹھا لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو کبڑیئے کا کُتا اس کی ٹانگیں لیتا تھا۔ یہ پاجی اپنے مالک سے بھی زیادہ ایک ایک آم کی رکھوالی کرتا تھا، اُس نے لڑکوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ گاؤں بھر میں سب سے اچھے اور میٹھے آم اور کوئی

بغیر پیسہ خرچ کئے انھیں کھا نہ سکے! اور پیسہ ان کے ماں باپ کے پاس نہیں! کسانوں کے گھر میں دو چار من غلہ تو پڑا ہو سکتا ہے، مگر نقدی علیہ السّلام، زرد و سپید سکے، ان کا وہاں کہاں گذر؟ اسلئے اُچک لینے اور چوری کرنے کو جی کیوں نہ چاہے؟ اور وہ بھی ایسے زمانے میں جب کہ سوائے اس باغ کے گاؤں میں کہیں اور آم نہ رہ گیا ہو۔

چنانچہ ان آموں کے حاصل کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لئے سبھائیں ہوتیں، جلسے کئے جاتے اور تجویزیں پاس ہوتیں۔ ان پھلوں کے چرالانے کے لئے بازیاں لگتیں اور انعام مقرر ہوتے، اور کبھی کبھی تو ان دو چار گرے پڑے آموں کے لادینے پر وہ کچھ مل جاتا جو مجنوں کو جنگلوں کی خاک چھاننے اور فرہاد کو پہاڑ کی چٹانیں کاٹنے کے بعد بھی نہ مل سکا تھا!

چندی جو اس باغ میں ایک اندھیری رات میں گھسا تھا وہ اسی غرض سے، اس کے بچپن ہی میں ماں باپ مر گئے تھے۔ برادری والوں نے اس کے سارے کھیتوں پر قبضہ کر کے اُسے اس طرح بے سہارا کر دیا تھا کہ وہ چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کا عادی سا ہو گیا تھا۔ پہلے یہ حرکتیں مدافعانہ تھیں۔ اُسے زندہ رہنا تھا۔ اور اس کے لئے جنگ ضروری تھی، لیکن جیسے جیسے وہ بڑھتا گیا اور اس کے بازوؤں میں قوت اور دماغ میں عقل آتی گئی، اس کی دفاعی تدبیریں جارحانہ کارروائیوں کی صورت اختیار کرتی گئیں۔ وہ ایک پیشہ ور فسادی، چور اور ڈاکو بن گیا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے وہ بد چلنی کے سلسلے میں محض شبہ پر ایک سال کی سزا کاٹ کر چھوٹا تھا۔ مگر جیل ہو آنے سے اس کی "مذموم صفتیں" اس

ہیں اور راسخ ہو گئی تھیں۔ جیل کی نامعلوم سختیاں ڈراؤنی نہ رہ گئی تھیں۔ بھوکے کے لئے گاؤں سے زیادہ قید خانے میں راحت تھی، اسی لئے اب اس کی قطع اس سانڈ کی تھی، جو داغ کر چھوڑ دیا گیا ہو اور جو یہ سمجھنے لگا ہو کہ اُسے اس کا فطری حق ہے کہ وہ ہر ایک ہرے بھرے کھیت کو چر ڈالے۔

مگر آج اس اندھیری رات اور موسلا دھار بارش میں، چندی کو بھوک اس باغ میں نہ لائی تھی۔ اس کی غرض اپنے لئے آم چرانا نہ تھی، اُس کا مقصد، ان آموں کو دل کی دیوی کی بھینٹ چڑھانا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی اپنے "انگوچھے" کے ایک کونے میں گرہ دی، اور اسے تھیلے کی شکل کا بنا لیا، پھر آہستہ آہستہ بلّی کی چال چل کر اُس نے دس بارہ آم مختلف تھالوں سے اُٹھا کر اس تھیلے میں رکھے۔ اس شاطر نے یہ کام کچھ اس صفائی اور احتیاط سے کیا کہ نہ تو کھٹک جاگا اور نہ کُتّے کو خبر ہوئی، پھر وہ اپنا یہ "پرشاد" لے کر اس طرف روانہ ہو گیا جدھر بدلیا رہتی تھی۔

بدلیا اسی کی ذات برادری کی ایک چمارن تھی۔ اپریل میں "گونا" کرا کے سُسرال آئی۔ اور جون میں ٹھاکر کی بیگار نے اُسے دُلھن کی جگہ بیوہ بنا دیا تھا۔ پتی کو چھ کوس ٹھیک دوپہر میں شہر تک ننگے پاؤں جانا پڑا۔ زمیندار کا حکم موت کی طرح ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ پلٹتے ہوئے میں لُو لگی اور گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی جلتی بھُنتی زمین پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ بدلیا نے مانگ کا سیندور دھو ڈالا۔ رنگین ساری اُتار کر وہ پھٹی پُرانی ساری پہن لی جس کے سوا اس کے پاس جسم ڈھانکنے کو اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ اور کبھی وقت مارے

رنج کے ایک دانہ تک مُنہ میں نہ ڈالا۔ لیکن اس سوگ منانے سے ساس نندوں کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہُوا۔ انہوں نے اسے "ڈائن" "گھر اُجاڑن" اور "جُن پھیری" ٹھہرا دیا اور اُسے اپنے پھُوس کے محل سے نکال کر بیلوں کے چھپر میں جگہ دی تا کہ اس کا منحوس سایہ ان کی "پوتر" دہلیز پر نہ پڑے۔ یہیں ایک کھرّے کھاٹ پر بدلیا پڑی رہتی تھی، دن رات میں ساس نندوں میں سے کسی کا اگر جی چاہتا تو وہ اسے تھوڑا سا ستّو، مٹھی بھر چنا، یا تھوڑی سی مٹر دے جاتی تھیں، ورنہ وہ تھی بیل تھے، مچھر تھے، گوبر تھا اور سڑے ہُوئے بھُوسے کی بُو تھی!

گاؤں کی چمر ٹولی، بہت چھوٹی سی جگہ ہوتی ہے، وہاں ایک دل کے دھڑکنے کی آواز دوسرے دل آسانی سے سُن لیتے ہیں۔ وہاں کوئی کام راز میں نہیں رہ سکتا ہر بات پھوٹ نکلتی ہے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اس "گھر نکالا" اور نئی سزا کی خبر سب کو مل گئی۔

بڑے بوڑھے تو سر ہلا کر چپ رہے لیکن لڑکوں اور نوجوانوں میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی، ہر ایک نے بدلیا کی مدد اپنے اُوپر فرض کر لی، کوئی لڑکا بڑوں کی آنکھیں بچا کر اپنے گھر سے گُڑ کا ٹکڑا اڑا دیتا۔ اور اس میں سے اپنا حصّہ نکال کر بدلیا کو دے آتا۔ کوئی اپنے حصّہ کا ستّو ختم کر کے اپنے کسی بھائی یا بہن کا ستّو گھما دیتا، اور اسے نئی بھوجی تک پہنچا آتا۔ کوئی دوسرے لڑکوں کی کوئی کھانے کی چیز چرا لیتا۔ اور اسے اِس دُکھ کی دیوی کے چرنوں میں چڑھا آتا تھا۔ نوجوان ادھر سے گنگناتے

نکلتے "بھوجی" کہہ کے بدلیا کو متوجہ کرتے اور دوسروں کی نظریں بچا کر ایک آدھ آم، یا دو ایک امرود پھینک آتے تھے۔

چندی بھی اس چھپر کے کئی پھیرے لگا چکا تھا۔ وہ اپنے کرتوتوں اب تک کنوارا تھا۔ اسی لئے دوسروں کی نسبتہ اس کی ہمدردی بھی زیادہ تھی۔ مگر بدلیا اسکی صورت سے ویسا ہی سہم جاتی تھی۔ جیسے کبوتر بحری کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔

اس لئے رات کی ڈراؤنی تاریکی میں جب وہ تنہائی، گرج اور چمک سے گھبرا گھبرا کر کروٹیں لے رہی تھی، چندی کا دبے پاؤں اس کے چھپر میں آنا اس کے لئے کسی طرح تسکین دہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یقینی اکیلے میں ساتھی کی بڑی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی ہمدرد پہلو میں ہوتا۔ اس سے مل کر بیٹھتے، اپنی بیتی کہتے، پرائی بیتی سنتے، پر یہ باتیں ہم جنسوں سے ممکن ہیں۔ بھیڑ اور بھیڑیے یا چڑیا اور شکرے میں نہیں ہو سکتی ہیں۔

بدلیا اسی لئے چندی کو پہچانتے ہی گھبرا کر کھاٹ پر اٹھ بیٹھی اور اس نے بڑا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

چندی مسکرا کر بولا "لو، بھوجی، تمہارے لئے ٹھاکر کے باغ کے آم لایا ہوں" یہ کہتے کہتے اس نے انگوچھے کی گرہ کھول کے، بالکل ایک پونجی پتی کے انداز سے کھاٹ پر آم ڈھیر کر دیئے۔ لنگڑے، دسہری، سفیدے کے پھل، ڈال پر پکے ہوئے، پورے رس پر، وہ خوشبو پھیلی کہ جگالی کرتے ہوئے بیلوں نے بھی بند آنکھیں کھول دیں۔ اور شیشے کی طرح چمکتی

آنکھوں سے ان کی طرف تکنے لگے، بدلیا جانتی تھی کہ چندی کا یہ تحفہ بے غرض نہیں ہے مگر
آموں کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ پھر بھی چندی کا ڈر غالب تھا۔ اس لئے اس نے انھیں
ہاتھ نہیں لگایا۔ چندی نے اتنی دیر میں انگوچھے کو نچوڑ کر اس سے بھیگا ہوا جسم پونچھا
پھر اسے باندھ کر گیلی دھوتی اتار کر نچوڑی اور باندھ لی۔

بدلیا کا دھڑکتا ہوا دل ذرا ٹھہرا ہی تھا کہ چندی اس کام سے فراغت کر کے بڑی
بے تکلفی سے کھاٹ کے پائتی بیٹھ گیا۔ بدلیا فوراً کھاٹ سے اُتر کر اس طرف زمین پر
بیٹھ گئی، جدھر بیل بندھے تھے، پاس والے بیل نے دو مرتبہ "فوں، فوں" کر کے اس کی
اس حرکت پر اپنا تعجب ظاہر کیا، مگر اس کی مانوس بو سونگھ کر پھر جگالی کرنے لگا۔ چندی
بدلیا کے اس پینترے پر ذرا ہنسا۔ بولا۔

"ہم کاٹ نہ لیں گے بھوجی، ہم تو تم سے یہ کہنے آئے ہیں کہ ہماری تمہاری
جوڑی اچھی رہے گی۔"

بدلیا کے ہاں گہرے کہرے کی طرح سکوت چھایا رہا۔ چندی سمجھانے والے انداز
میں بولا۔ "میرا جھونپڑا بن گھر والی کے سونا لگتا ہے، اور تم بن مرد کے دُکھی ہو۔"

مگر گویا بدلیا گونگی تھی، اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چندی نے آدھے دھڑ سے کھاٹ
پر لیٹ کے اس کی ٹھوڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بولتی کیوں نہیں بدلی؟"

وہ ہاتھ جھٹک کے آہستہ سے بولی۔ "ہمیں ایسی باتیں ناپسند ہیں! تم یہاں سے
چلے جاؤ!" چندی پر اس جھڑکی کا الٹا اثر ہوا۔ وہ کھاٹ پہ گھوم کر اس طرف پاؤں لٹکا

کے بیٹھا جدھر بدلیا تھی، وہ سہم کر پیچھے ہٹی۔ چندی پھر ہنسا۔ اس نے اچانک جھک کر بدلیا کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا، بدلیا چیخ پڑی۔ وہ اتنے زور سے چیخی کہ بیٹھے ہوئے بیل پھپکاریاں مارتے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بدلیا کی ساس نندیں جاگ اُٹھیں۔

چندی نے بدلیا کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اور گھبرا کر کہا "اچھا، اچھا، چیخ مت۔ لے ہم جاتے ہیں پر دیکھ آم ضرور کھا لینا۔" یہ کہہ کر وہ جھپٹ کر باہر نکل گیا۔ مگر ویسے ہی بدلیا کی ساس جھونپڑے میں "ارے کیا ہے ڈائن؟" کہتی ہوئی داخل ہوئی۔ اسے کسی کے بھاگنے کی آہٹ مل ہی چکی تھی۔ اب جو دیا جلا کر اُس نے دیکھا تو یہ سماں نظر آیا کہ بدلیا کھاٹ سے الگ کھڑی، بڑے بڑے دیدے نکالے، ڈری سہمی اُسے دیکھ رہی ہے اور کھاٹ پر اچھے اچھے آم ڈھیر ہیں۔ بس برس پڑی "ڈائن، بیسوا، ہرجائی، میرے کلوا کو کھا کر اب یار بلاتی ہے، رہ تو جا، سویرا ہونے دے، برادری بھر کے سامنے تیری مانگ نہ مونڈ دی تو اپنے باپ کی جنی نہ کہنا۔"

اتنے میں نندیں بھی اپنے بچے بغلوں میں دبائے آ پہونچیں، وہ بھی ماں کے ساتھ مل کے بھن بھنانے لگیں۔ پھوس کے چھپروں میں رہنے والی جھونپڑ ٹولی یوں ہی مینہ برسنے اور چھپر کے ٹپکنے سے جاگ رہی تھی۔ یہ شور سن کے دوڑ پڑی، پانی تھم گیا تھا، اس ہنگامے کی آواز دور تک بآسانی پہنچی۔ بارے بڑی دیر جھک جھک بک بک کے بعد طے ہوا کہ صبح یہ معاملہ اُٹھا رکھا جائے، اور اس وقت پوری تفتیش کر کے برادری سزا دے۔ اس فیصلہ کے بعد اور سب تو چندی کے لائے ہوئے آموں پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے

گھر سدھارے، مگر چھوٹی نند نے ٹھٹک کے اس ڈھیر سے چُن کے چار آم اُٹھا لئے، پھر وہ ایک کو دانت سے چھیلتی چل دی۔

بدلیا نے وہی اطمینان محسوس کیا، جو بحری مسافر طوفان کے بخیر و خوبی ختم ہو جانے پر محسوس کرتے ہیں لیکن اس اطمینان سے اُسے کسی قسم کی خوشی نہیں ہوئی۔ بلکہ رنج کا احساس اور زیادہ ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تو بیٹھی اپنی پھوٹی تقدیر پر روتی رہی۔ پھر وہ اُٹھی اور اُس نے جھپٹ کر ایک ایک کر کے آم اُٹھائے، اور انھیں چھپر کے باہر پھینکنا شروع کیا۔ دو تین پھل غصّے میں پھینکے تھے کہ ایک دسہری ہاتھ میں آ گئی، وہ خوشبو، وہ رائحہ، وہ نرم نرم پھسلتی ہوئی جلد کہ توبہ ہی بھلی! پھینکنے کے لئے اُٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ اُس نے بے ساختہ اُسے ناک کے قریب لیجا کر سونگھا۔ معلوم ہوا جیسے بپھری ہوئی ناگن کو جڑی سونگھا دی گئی ہو جھومنے لگی۔ اُس نے دو ایک بار زبان کا سرا ہونٹوں پر پھرایا۔ پھر "اُٹھ کر کے زمین پر اکڑوں بیٹھ کے اُسے دانت سے چھیل کر کھانے لگی۔ چھپر میں بڑی دیر تک بیلوں کی جگالی اور بدلیا کے چٹخاروں کی آواز میں مقابلہ ہوتا رہا۔ البتہ یہ چٹخارے درمیان میں صرف اتنی دیر تک رکتے تھے جتنی دیر کہ بدلیا کو اپنے پھینکے ہوئے آموں کو پھر سے چُن کر لانے میں لگتی تھی۔۔۔۔ پھر تو بیلوں کو مینڈکوں کی غرغراہٹ ہی نہ سننا پڑی بلکہ بدلیا کے خرّاٹے بھی!۔۔۔ اور اُنھوں نے جگالی کر کے یہ سب اَنگیز کیا۔

دوسرے دن صبح سویرے "جنگل" سے پلٹتے ہی ساس نندوں نے مرے ہوئے

بیٹے بھائی کا نام لے لے کر وہ "کوّا گھار" مچاتی کی برادری کی چمارنیں اکٹھا ہو گئیں۔ بدلیا خمار آلود آنکھیں لیئے ان کے بیچ میں چپ بیٹھی رہی۔ بار بار پوچھنے پر اُس نے گنگو کی سوگند کھائی کہ اس کا کوئی یار نہیں ہے، اور نہ اُس نے کسی سے کہہ کے آم منگائے تھے۔ "تو یہ کیوں نہیں بتاتی کہ کون لایا تھا"، ساس نے چمک کر کہا۔

بدلیا نے آہستہ سے کہا "چندی آم لائے اور ہم پر ہاتھ ڈالا، ہم چیخے، وہ بھاگ گئے، ساس آ گئیں"۔

چھوٹی نند جس سے چندی سے ایک زمانے میں دوستی رہ چکی تھی، کولھے پر ہاتھ رکھ کے بولی "پرائے گھر میں جب تک کوئی بلایا نہ جائے، آئے گا کاہے کو"

ایک چمارن بولی "ارے نہیں، وہ بڑا پاجی ہے"۔

دوسری نے کہا "پر یہ بھی سچ ہے، کہ اس میں کلو بہو کا بھی دوش ہے"۔

ساس چیخی "دوش سا دوش ہے، ارے لوگو اس ڈائن نے میرے کلوا کو کھا لیا! اب یہ یار ڈھونڈھتی ہے۔ چوری کا مال اُڑاتی ہے، ارے یہ ہم لوگوں کی ناک ہی نہ کٹوائے گی، یہ ہم لوگوں کو جیل بھجوائے گی جیل!"

بڑی نند نے بدلیا کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا "تو مار کے نکال دو اس پاجن کو" اور یہ کہتے کہتے اس نے بدلیا کو ایک طمانچہ رسید ہی تو کر دیا۔ بدلیا بوکھلا گئی۔ مگر قبل اس کے کہ اپنے کو بچانے کی کوئی تدبیر کر سکے، چھوٹی نے بڑھ کر ایک دھول رسید کر دی، اب تو ساری چمر ٹولی پل پڑی، کوئی چمارن کوس رہی ہے، کوئی بال نوچ رہی ہے۔ بدلیا نے جب جان بچتی نہ دیکھی، تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اور موقع پاتے ہی مجمع سے نکل کر، دیوانہ وار

بھاگی۔ اس کا سانولا چہرہ پختہ اینٹ کی طرح سُرخ تھا، اُس کے بال کی لٹیں سوار کیطرح اُلجھی ہوئی، بے قرینہ... اور کندھوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کا جسم رہ رہ کر اسی طرح کانپ اُٹھتا تھا جس طرح زلزلہ کے ہر جھٹکے میں مکان اور درخت ہل جاتے ہیں۔ اُس کے نتھنوں سے گرم گرم سانس نکل رہی تھی، اس کا حلق بالکل خشک تھا۔ اور اس کی آنکھیں سامنے کے راستہ کو نہ دیکھتی تھیں، بلکہ بہت دور کسی منزل کی جستجو میں تھیں، وہ اسی طرح بدحواس پکڑ کے درخت تک پہنچی، جو چمر ٹولی کے قریب ہی تھا۔ اس نے اس کی اُبھری ہوئی جڑ سے ٹھوکر کھائی، اور مُنہ کے بل زمین پر گر پڑی۔

اس اچانک گرنے نے دل میں بھری ہوئی ساری تکلیفوں کو ایک لڑی میں گوندھ دیا، اور وہ زمین پر مُنہ رکھے سسک سسک کر رونے لگی، گویا زمین نہ تھی بلکہ ماں کا سینہ تھا جس سے سر لگا کر رو لینے میں آرام ملتا ہے۔ وہ یوں ہی پڑی سسک رہی تھی کہ پتّوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور چندی پکڑ کی موٹی موٹی شاخوں سے اُترتا ہوا زمین پر مع اپنی لاٹھی کے دھم سے کودا۔ بدلیا اس دھماکے پر ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اُٹھ بیٹھی، ایک نامعلوم خطرے کے خیال نے اس کے دل میں حد درجہ ڈر پیدا کر دیا، اس کے دماغ نے چندی کو ایک نئے حملہ آور کی شکل میں پیش کیا، وہ جلدی سے اُٹھ کر پھر بے تحاشا بھاگی اس کی قطع اس پانی سے بھری صراحی کی تھی۔ جو کسی ڈھالواں مقام پر لڑھکا دی جائے صراحی کی طرح اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ اس کے حلق سے آواز نکلتی جاتی تھی اور اس کی چال لڑکھڑاتی اور ٹیڑھی تھی۔

چندی چند سکنڈ بدلیا کے اچانک بھاگنے پر اُسے منہ کھولے دیکھا کیا۔ پھر وہ اس کے پیچھے اس طرح دوڑا، جس طرح شکاری کسی چڑیا کو زخمی کر کے پکڑنے دوڑتا ہے، بدلیا لڑکھڑاتی، بلکتی، سسکتی، پاس والے تخمی آموں کے باغ تک دوڑی، پھر اُسے چکر سا آنے اور باغ لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ وہ لپک کر سب سے پہلے درخت کے تنے سے اس طرح جا کر چمٹ گئی جس طرح بچے کسی اجنبی سے ڈر کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے ہیں

چندی قریب پہنچ کر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا، "ارے کہاں جاتی ہے بدلی؟ کیا میکے میں ساس نندیں تجھ کو رہنے دیں گی، اُنھوں نے تجھ کو اپنے گھر سے نکال دیا، وہ تجھ کو وہاں سے بھی بدنام کر کے نکلوا دیں گی، ارے پگلی کہنا مان، دوسرا گھر بسا!"

بدلیا بھد سے زمین پر بیٹھ گئی، اور بڑی بے بسی سے رونے لگی۔ چندی اُسے سمجھاتا رہا۔ مگر ہمدردی کی آواز تازیانہ کا کام دیتی رہی، گویا چندی کے الفاظ نہ تھے بلکہ ڈاکٹر کا نشتر تھا، جو جگر کے ناسور کو پھیلا اور بڑھا کر مواد کے نکلنے میں مدد دے رہا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ بے کسی و ناکسی کا طوفانی احساس کم ہونا شروع ہوا۔ مد کی جگہ جزر نے لی۔

چندی نے قریب کھسک کر کہا، "ارے بدلی، اس رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو ہمارے ساتھ چل کے رہ، پھر کسی کی اتنی ہمت نہ پڑے گی کہ تجھ آدھی بات بھی کہہ سکے۔"

بدلیا نے ایک دزدیدہ نگاہ چندی پر ڈالی۔ اچھا خاصا جوان تھا۔ عام چماروں کی طرح سوکھا، لاغر، بھوکا نہیں معلوم ہوتا تھا، صورت شکل بھی بُری نہ تھی، چہرے سے جرأت اور نڈری کے آثار نمایاں تھے، آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے جلدی سے سر جھکا لیا، چندی مسکرایا۔

"ارے پگلی، جب سب تجھکو دوش ہی لگاتے ہیں۔ تو بھر کر کے کیوں نہ دکھا دے؟ کسی کا دیا کھاتے ہیں کہ ڈر ہے؟"

بدلیا نے اور گردن جھکا لی۔ چندی نے آگے بڑھ کر ٹھوڑی میں ہاتھ دے کے جھکے سر کو اُٹھایا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورا، اس نظر میں خوشامد بھی تھی ہمدردی بھی تھی۔ اور دنیا بھر سے بدلیا کے لئے لڑ جانے والا ارادہ بھی تھا۔ پھر بدلیا کی بھیگی ہوئی پلکیں اس کے آنچل سے پونچھ کر بولا۔ "لے اب اُٹھ، گھر چل"

وہ کاندھے پر لاٹھی رکھے آگے آگے چلا، بدلیا گھونگھٹ نکالے اس کے پیچھے پیچھے ہولی، جب دونوں چمر ٹولی سے ہو کر گذرے، تو بدلیا کی ساس اور بڑی نند نے راستہ روکا۔ وہ جھڑک کر بولا۔

"ہٹ جاؤ راستہ سے، نہیں تو سر پھوڑ دیں گے"

وہ ڈر کے پیچھے ہٹیں، تو چھوٹی ہاتھ چمکا کر بولی "ارے یہی رات کو آم لایا تھا" چندی پلٹ پڑا، اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں "ہاں! ہاں! ہمیں لائے تے۔ وہ رات کی چوری تھی ٹھاکر کے باغ کی! یہ دن کا ڈاکہ ہے تمہارے گھر کا!"

بڑی نند نے کہا: "وہ ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ یہ ڈائن ناک کٹوا کے چھوڑیگی۔"
چندی نے کندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی زمین پر زور سے کھینچ ماری، تینوں عورتیں جلدی سے چھپر میں گھس کر دروازے سے جھانکنے لگیں، چندی نے ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار جو کبھی ڈائن کہا، یہ اب ہماری مہریا ہے۔"

پھر ایک بار لاٹھی گھما دی۔ تینوں نے جلدی سے اپنے سر اندر کر لئے ——

—— اور یہ سپیرا مع اپنی نئی ناگن کے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

امتحانِ قدر

نعیم اور محمود کی ملاقات کچھ آج کی نہ تھی۔ تقریباً پندرہ برس سے دونوں میں
بے تکلفی کی دوستی تھی۔ تعارف کا ذریعہ نواب احسان علی خاں بنے تھے۔ محمود اس زمانے
میں ان کی مصاحبت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اور اصل میں ان کا درباری مسخرہ تھا۔
یہ بھی عجیب و غریب پیشہ ہے، اس کی انجام دہی انسان کو ذلیل ترین حرکات کرنے پر مجبور
کرتی ہے تاکہ اس کے ولی نعمت کے کریہہ چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دے
پیٹ کا مارا محمود کبھی گدھا بنتا، کبھی خچر کبھی طرح طرح کی چڑیوں کی بولی بولتا۔ دن رات
نئے نئے فقرے تراشتا۔ نئی نئی پھبتیاں سوچتا۔ اسی پر اکتفا نہ ہوتی، بلکہ جہاں ولی نعمت
اور ولی نعمت کے ساتھیوں کا ہنسانا فرض تھا، وہاں ولی نعمت کے لیے نمک فقرہ ...

پر ہنسنا اور اکثر جھینپنا بھی ضروری تھا۔

ہندوستانی امیروں کا دربار فحش کے لئے مشہور رہا ہے۔ ان کے ہاں مزاح کے معنی مذاق اور مذاق کے معنی گالیاں ہیں۔ محمود کو مسخرگی کی بدولت دن رات میں سیکڑوں گالیاں سُننا پڑتیں اور ہزاروں پھبتیاں پھر اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ نواب کو کوئی بات ناگوار گزرے اور روٹیوں کا سہارا بھی جاتا رہے۔ لوگ کہتے محمود چکنا گھڑا ہے، اس پر کسی فقرے کا بھلا اثر ہوتا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ خاکستر میں چنگاریاں بعض وقت دبی ہوتی ہیں اور گرد میں سوار، اور گدڑی میں لعل بھی ہوتے ہیں۔

نعیم صاحب نے پہلے ہی دن کی ملاقات میں محمود کی آنکھوں کا درد دیکھ لیا۔ اُنھوں نے محسوس کر لیا کہ محمود کی ہنسی کے اجزائے ترکیبی میں نالہ ہائے نیم شبی بھی داخل ہیں۔ اسی لئے انھوں نے پہلے ہی دن سے محمود سے قدرے خلوص برتا اور اس کی دستگیری اپنا شعار بنا لیا۔

محمود کو اس دستگیری کی ضرورت بھی تھی۔ دس روپیہ کا ملازم، سرائے میں قیام، بی بھٹیارن نئے نئے طریقوں سے اس سے موعودہ مقدار سے کہیں زیادہ پیسے وصول کر لیتی تھیں۔ کھانے کا چار روپیہ مہینہ، اور کمرے کا ایک روپیہ ماہوار طے تھا۔ لیکن بی بھٹیارن کے یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ پیش آجاتا کہ محمود کو اُن کی مدد کرنا پڑتی۔ کبھی کوئی عزیز قریب مر جاتا اور غمی میں شرکت کے لئے اُن کے پاس یکہ کے کرایہ کے پیسے نہ ہوتے۔ کبھی کوئی بدمعاش اُن کی ٹوٹی پتیلیوں میں سے ایک کھسکا دیتا۔ غرض طرح

طرح کی آفتیں آتی رہتی تھیں اور محمود کا نرم دل ایک عورت کو ان آلام میں گرفتار نہ دیکھ سکتا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ پانچ روپیہ میں مٹی کا تیل، دھوبی کی دھلائی، ملنے والوں کے لئے پان تمباکو پھر اس پر حقوق ہمسایہ، کتنے کام انجام پا سکتے تھے؟ چنانچہ غریب محمود اکثر مقروض رہتا تھا۔

مگر یہ عجیب بات تھی کہ جتنی پریشانیاں بڑھتیں، اُتنی ہی محمود کی ہنسی بڑھتی۔ جب اطمینان ہوتا تو مسکراہٹ متانت کے ساتھ خراماں چہرے پر آتی، لیکن جب جیب خالی ہوتی تو ہنسی چہرے پر دوڑتی پھرتی۔ نعیم کو اُس کی یہ ادا خاص طور سے پسند تھی۔ جہاں وہ زیادہ ہنسنا شروع کرتا یہ تاڑ جاتے۔ طرح طرح کی خاطریں کرتے۔ نواب کے یہاں سے کسی نہ کسی بہانے سے اُٹھا لاتے اور بڑے اصرار سے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ چلتے وقت چپکے سے ایک آدھ روپیہ جیب میں ڈال دیتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ محمود نعیم کی اس شرافت اور محبت پر ہنسنے کی جگہ رونے لگا۔ لیکن نعیم نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا "بھائی محمود اگر اتنی سی بات میں بھی غیریت برتو گے تو دوستی کیسی؟ ارے میاں آج میں تمہاری خدمت کر سکتا ہوں، ممکن ہے کہ کل مجھ پر کوئی آفت آئے اور تم کام آسکو!"

محمود اس گفتگو پر "شیر اور چوہے" والا قصہ یاد کر کے رونے میں بالکل اسی طرح ہنس دیتا جیسے پانی برسنے میں دھوپ نکل آئے!

محمود کو پٹنہ چھوڑے ہوئے آٹھ دس برس ہو چکے تھے۔ اس زمانہ میں وہ نہ معلوم

کہاں کہاں کی خاک چھان چکا تھا۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس، راجپوتانہ، کشمیر، ہندوستان کے ہر گوشے میں ٹھوکریں کھائیں سیکڑوں نوکریاں اور صدہا پیشے کیے۔ کبھی ٹریم پر ٹکٹ کلکٹری کی تو کبھی موٹر پر صفائی کا کام کہیں بچوں کی اتالیقی کرنا پڑی تو کہیں پہ بیڑی سگریٹ بیچکر گزر اوقات کا وسیلہ ہاتھ آیا۔ غرض بیس برس بعد لکھنؤ اپنے وطن پلٹنا نصیب ہوا۔

جس شخص نے دُنیا کا اس قدر سرد و گرم دیکھا ہو، جو ملک کے بڑے سے بڑے امراء و رؤسا کے درباروں میں بیٹھا ہو، جس نے ملک کے بدمعاش ترین خطہ کے ساتھ عمر کا خاصا حصّہ کاٹا ہو، اُس کے متعلق یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہت ہی نیک آدمی تھا۔ نہ کبھی اُس نے جھوٹ بولا، اور نہ کبھی بے ایمانی کی۔ محمود کے متعلق جو دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف اتنا ہے، کہ وہ انسان تھا اور باوجود مختلف طرح کی کمزوریوں کے اس میں بہت کچھ حمیّت تھی، بہت کچھ شرافت تھی اور سب سے بڑی بات، اس کے دل میں بہت سا درد تھا۔

وہ اس حقیقت سے خوب آگاہ ہو چکا تھا کہ آج کل کی دنیا میں نہ تو فرشتے ہوتے ہیں اور نہ مجسّم شیطان۔ پاجی سے پاجی آدمی میں شرافت کی جھلک ہوتی ہے اور نیک سے نیک لوگوں میں بُرائی کا شائبہ۔ اُس کے لئے پتھر میں ہیرا اور سیب میں کیڑا کوئی نئی بات نہ تھی یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کی پروا نہ کرتا، بلکہ ان کے نفس اور ان کی طینت پر نگاہ رکھتا۔

نعیم کے متعلق وہ اتنا جانتا تھا کہ پٹنہ میں اگر کوئی ایسا شخص ہے، جس نے اُسے انسان

سمجھا تو وہ صرف ایک وہی ہے۔ وہ اس سے واقف تھا کہ نعیم قدرے منچلا ہے۔ اسے حسنِ نسوانی کی کشش مجنوں تک بنا دیتی ہے اور اس کی صحبت زیادہ تر رنگین ہے، لیکن وہ ان تمام امور کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا اور صرف اتنا یاد رکھتا کہ نعیم نے اس پر ہمیشہ احسان کیا، اور باوجود ایک متموّل رئیس ہونے کے اس سے بھائیوں کا سا برتاؤ کیا پھر بھی محمود اپنی حیثیت سے واقف تھا۔ اور محسن و احسان مند کے تفاوت کو جانتا تھا۔

اسی بنا پر جب اُس نے اپنے محسن کو بالکل ایک جنٹلمین کی طرح ایک ہندوستانی عورت کے ساتھ بیلی گارد میں ٹہلتے دیکھا تو اس نے صرف ایک گائڈ کی حیثیت سے سلام کرنے پر اکتفا کی۔ دل میں خیال تھا نعیم صاحب اگر مناسب سمجھیں گے تو پہچانیں گے، ورنہ دوستی کی گرم جوشی کی جگہ رہنمائی کے خشک غیر جذباتی فرائض سہی، لیکن نعیم صاحب اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولے "بھئی محمود۔ خوب ملے۔ کیا آج کل یہاں بیلی گارد میں رہنمائی کرتے ہو؟"

محمود نے مسرور ہو کر جواب دیا۔ "جی ہاں آج کل یہیں ہوں۔"

نعیم نے کہا "یار، تم خوب ملے۔ ہم لوگ بھی لکھنؤ گھومنے ہی آئے ہیں۔"

محمود بھلا اب کہاں چُپ رہنے والا تھا، جذبات کی موجوں میں زبان چھوٹی سی کشتی کی طرح بہ چلی "تو بھلا مجھ سے بہتر اس کام کو کون انجام دے سکتا ہے آصف الدولہ کا امام باڑہ۔ حسین آباد۔ گھنٹہ گھر، کمپنی باغ، لوہے کا پل، چھتر منزل، قیصر باغ، حضرت گنج، سکندر باغ۔ کون ایسا مقام ہے جس کے کونے کونے سے میں واقف نہیں ہوں شام

ادوھ دیکھنا ہو تو اکبری دروازے سے چوک میں داخل ہوجیے۔ تماشائیوں کی چہل پہل دیکھیے۔ جاڑوں میں شالی چادریں کندھوں پر پڑی ہوئی، لوگ بانکے بنے چلے آرہے ہیں۔ چائے کی دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ سپید سپید پیالیوں میں عنابی رنگ کی چائے اس پر بالائی پڑی ہوئی۔ گرم اتنی کہ ایک گھونٹ پینے میں جہنم کے فرشتوں کے ہونٹ جلیں گرمیوں میں انھیں دوکانوں پر شربت دفالودہ۔ ہر ایک پیالہ اتنا یخ، کہ کرۂ زمہریر کے رہنے والے چھوتے ہی ٹھنڈے ہوجائیں۔ پھر سرد و ہمسایہ مفت کا پریوں کا نظارہ گھاتے ہیں! اگر جدت پسندوں کی تراش خراش، کوٹ پتلون کی نوک پلک دیکھنا ہو تو امین آباد اور حضرت گنج کی سیر کیجیے۔ موٹروں کی وہ افراط کہ الامان و الحفیظ! جسے دیکھیے کالا ہو یا گورا، ایک پٹے کٹی بغل میں بٹھلائے لئے اُڑا جاتا ہے۔ پھر سینما میں پرنس آف ویلز، "پلازا، کیپٹل" "القسٹن"، "رائل یونیورسل، کبھی لاری میں اشتہارات تقسیم ہو رہے ہیں، تو کبھی مسخروں کی برات کی شکل میں کہیں پر مس فیروزہ ناچتی ہیں تو کہیں پر مس گلزار۔ غرض کیا بتاؤں لکھنؤ سی جگہ، آپ سا دیکھنے والا، مجھ سا دکھانے والا، واللہ ایسی ایسی چیزیں دکھاؤں کہ یہ نہ معلوم ہو کہ دن کب تمام ہوا، اور رات کب ختم ہوئی!"

نعیم ہنس کر بولے "یار ان چیزوں کے دیکھنے سے زیادہ تو تمہاری باتوں میں مزہ آگیا۔ بس اب لکھنؤ کی سیر تمہارے ساتھ ہی ساتھ ہوگی۔"

وہ عورت جو نعیم کے ساتھ تھی، چپکی کھڑی مسکرا یا کی، محمود بھی نثر میں شاعری کرتا جاتا اور اسے کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ اگر اسی کے الفاظ میں اس کی تصویر کشی

کی جائے تو وہ معمولی انسانوں کی صفوں سے نکل کر قاف کی پریوں میں شامل ہو جائے گی۔ اس کا بیان ہے کہ گلاب کی پنکھڑیوں کو نچوڑ کر سونے میں ملایا تھا۔ اِس میں ہلکا سا شہاب شامل کر کے ایک خاص رنگ تیار کیا تھا جس سے اس کے گال بنائے تھے ایسی لیئے ان میں کندن کی زردی بھی تھی اور گلاب کی سُرخی بھی۔ پھر رگیں تھیں یا زمرد کی قلمیں آنکھیں غزالوں کی طرح بڑی تھیں۔ لیکن ان میں چمک ویسی تھی جیسے گل بنفشہ پر شبنم کا قطرہ سورج کی اولیں شعاعوں میں درخشاں ہو۔ اس کے ہونٹوں کی کیفیت اور تکلم میں ان کی حالت اس شخص کے فہم سے باہر ہے۔ جس نے گلاب کی کلی کو اپنی آنکھوں سے کھلتے نہ دیکھا ہو۔ اس کی چال میں کبک خرامی کے ساتھ ساتھ رم بھی تھا اور جسم میں سرو کی استقامت کے ساتھ بید کی لچک بھی۔ جب محمود سے لسان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کم ہو جاتا تو وہ جھوم جھوم کر کہتا۔

گل رخش، سرو قدش، غنچہ لبش، نرگس چشم

از بہار انچہ بجا ماند تنے ساختہ اند

محمود نے سلسلہ گفتگو ختم ہونے پر اس حُسن کے مجسمہ کو نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔ پھر نعیم پر سوالیہ انداز سے نظر کی اُنھوں نے کچھ گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ . . . . ایں . . . . . ایں . . . . تمہاری نئی بھابی ہیں!"

محمود نے کچھ جھینپ کر "نئی بھابی" کو سلام کیا۔ انھوں نے شرما کر جواب دیا۔ نعیم مسکراتے پھر بولے "اچھا میاں محمود تو آج تم ہم لوگوں کو بیلی گارد کی سیر کراؤ۔ پھر

شام کو ہوٹل میں ملو اور وہیں ہفتہ بھر کی سیر کا پروگرام تیار ہوگا۔

اُس دن ایک گھنٹہ سے زیادہ محمود ریزیڈنسی کا چپہ چپہ دکھاتا رہا اور اس نے نہ معلوم کتنے سچے جھوٹے قصے نعیم صاحب اور "نئی بھابی" کو سنا ڈالے۔ وہ فطرتاً نثر کا "بدیہہ گو" تھا۔ جب اِس طرح کا زریں موقع ہاتھ آئے تو پھر زبان قینچی کی طرح کیوں نہ چلے اور اشعار منثور کی سینکڑوں لڑیاں کیوں نہ تیار ہو جائیں؟

ایک ہفتہ نعیم صاحب کا قریب قریب رات دن ساتھ رہا۔ بھلا اس یار باشی میں ریزیڈنسی کی رہنمائی کے فرائض کب یاد رہ سکتے تھے! اس لئے وہاں سے "فرانسیسی چھٹی" لے لی۔ نعیم صاحب کو لکھنؤ کا گوشہ گوشہ دکھا ڈالا۔ "نئی بھابی" سے پہلے بے تکلفی ہوئی پھر اختلاط بڑھا۔ پھر اختلاط نے کشش کی صورت اختیار کی، وہ جذبہ میں منتقل ہوئی اور بالآخر اس جذبہ کی وسعت و عمق کی سرحدیں عشق کے لامحدود دائرے میں مُستحل ہو گئیں۔

لیکن وہی خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری، وہی مبالغہ، جھوٹ اور ریا میں چھپی ہوئی جمیت آڑے آئی۔ وہ جانتا تھا کہ صفیہ نعیم صاحب کی کس طرح کی بیوی ہے۔ وہ ان کے خاندانی روایات اور طرزِ معاشرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن جب وہ صفیہ کو بالاعلان "اپنی بیوی" کہتے تھے تو پھر محمود کو اس کا کیا حق تھا کہ وہ اسے اپنے محسن نعیم کی ناموس نہ سمجھے؟ چنانچہ محبت دل ہی دل میں بڑھتی رہی۔ آگ اندر ہی اندر سُلگا کی، لیکن محمود نے خود اپنے دل سے اس جذبہ کے وجود کا اقرار نہ کیا اور

اپنے افعال و حرکات سے کسی کو کسی عنوان مشتبہ نہ ہونے دیا۔

ایک روز صبح کو وہ حسب معمول ہوٹل پہونچا تو نعیم صاحب نے بہت لمبا چہرہ بنا کر اس سے کہا "یار محمود کیا کہوں کل بمبئی سے تار آیا ہے۔ کہ میرے ایک عزیز قریب وہاں بیمار ہیں۔ مجھے جلد سے جلد وہاں پہونچنا چاہیئے۔

محمود نے کہا "ہاں ہاں، یقینی۔ تو اسباب باندھا جائے؟"

نعیم نے کہا "ہاں جی وہ تو باندھا ہی جائے گا۔ دقت یہ ہے کہ میں تمہاری بھابی کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ بیماری کا معاملہ ہے۔ خدا جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے۔"

محمود نے کہا "تو کیا انھیں پٹنہ پہونچا آؤں؟"

نعیم تھوڑی دیر سر کھجایا کئے پھر بولے "نہیں یار۔ ان کا تمہارے ساتھ جانا اچھا نہیں، میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ انھیں یہیں تمہاری حفاظت میں چھوڑ جاؤں۔"

محمود نے اپنے استعجاب کو چھپا کر جلدی سے کہا "تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔۔۔۔ شاید آپ کے دل میں کوئی اور خیال۔۔۔۔ ہو تو میں آپ سے بہ قسم کہتا ہوں کہ میں اُن سے اسی طرح۔۔۔۔ پیش آؤنگا جس طرح اپنی حقیقی بہن سے۔۔۔۔

نعیم نے بات کاٹ کر کہا۔ ارے یار بیکار کی قسمیں کیوں کھا رہے ہو۔ تم پہ شک کس مردود کو ہے۔ میں تمہاری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے ان باتوں

کا مطلقاً خیال نہیں، مجھے جس امر کی فکر ہے وہ یہ ہے کہ میرے پاس اس وقت اتنے روپے نہیں کہ اُن کے لئے کافی خرچ دے جاؤں۔"

محمود نہایت بے پروائی سے بولا " ادھر روپیہ پیسے کی کیا فکر۔ میں موجود ہی ہوں سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔"

غرض اسی دن شام تک کرایہ کا ایک مکان لے لیا گیا۔ ایک بوڑھی ماما ڈھونڈھ لی گئی اور صفیہ نئے مکان میں اٹھ آئی۔ دس بجے شب کی گاڑی سے نعیم صاحب بمبئی میل پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ سٹیشن تک محمود اور صفیہ بھی گئے تھے۔ صفیہ کی حالت دن ہی سے قابلِ افسوس تھی۔ چہرہ زرد، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، بات بات پر آنسو نکلے پڑتے تھے، اسٹیشن سے واپسی پر محمود نے پچیسیوں فقرے چست کئے اور بیسیوں لطیفے بیان کئے تب جا کر صفیہ کے چہرے پر قدرے مسکراہٹ دکھائی دی پھر بھی غم کی گھٹا اتنی تاریک تھی کہ یہ مسکراہٹ بھی محض ایک لمحہ کے لئے چہرے کو چمکا سکی محمود کی یہ حالت کہ جتنا ادھر اضمحلال بڑھتا اور افسردگی میں اضافہ ہوتا اتنا ہی اسے اس امر کا احساس ہوتا کہ صفیہ اور نعیم کی محبت معمولی نہیں۔ جدائی کی چند گھڑیاں بھی سخت ترین مصیبت بن گئی تھیں۔ اسی کے ساتھ اس کی ذمہ داری اور اس کے وعدہ کا ایفا دونوں حد درجہ اہم ہو گئے تھے۔ قدم ڈگمگا رہے تھے، پاؤں کے نیچے کی زمین نکلی جا رہی تھی، امتحان سخت تھا۔ سہارا صرف دنیا کی بُرائیوں میں دبی ہوئی حمیت کا! بس خدا ہی یہ کام انجام تک پہونچائے!

نعیم صاحب کو گئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ گزر گئے۔ صفیہ کی افسردگی نے مستقل صورت اختیار کر لی۔ غم سے روز بروز گھٹنے لگی کھلتی ہوئی کلی مرجھانے لگی۔ محمود صبح و شام دل بہلانے جاتا۔ کبھی دیو پریوں کا قصہ کہتا۔ کبھی ظریفانہ چٹکلے بیان کرتا۔ کبھی مختلف جانوروں کی بولیاں بولتا۔ کبھی ان کے حرکات کی نقلیں کرتا۔ لیکن صفیہ اس پودے کی طرح جو ایک جگہ سے دوسری جگہ بے احتیاطی سے منتقل کیا گیا ہو سوکھنے لگی۔ ایک تو یوں ہی دھان پان، پھر غم کا بوجھ۔ صحت خراب ہوئی۔ لکھنؤ کا تحفہ ملا، حرارت اور کھانسی شروع ہو گئی محمود نے طبیبوں اور ڈاکٹروں کے پاس دوڑنا شروع کیا، نسخے لکھوانا دوائیں لانا، خود ہی کوٹ پیس کر تیار کرنا، پھر ہزار بہانوں سے پلانا روزانہ کے فرائض بنے۔

ایک دن جب کہ وہ معدن الادویہ سے دوا لے کر واپس آیا تو صفیہ سست پلنگ پر پڑی تھی۔ کلیجے پر تو تیر سا لگا لیکن ظاہر میں ہنس کر بولا "حکیم صاحب تو قسم کھاتے ہیں کہ اس دوا کی تین خوراک پیتے ہی ہنسنے کھیلنے لگیں گی، اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ گز گز لمبا چہرہ بنا کر مجھے ڈرائے دیتی ہیں۔ واہ بھابھی واہ! کہیں بھائی صاحب ایسی حالت میں دیکھ لیں تو میں کہیں کا نہ رہوں!"

صفیہ بجائے اس کے کہ اس فقرے پر ہنسے یا مسکرائے رو دی۔ اور یہ جتنا اس کے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا اتنا وہ روتی ہی گئی۔ بالآخر بولی "محمود میاں میں تمہاری سب باتیں سمجھتی ہوں لیکن میں کمزور عورت ذات، بے بس ہوں کیا کروں۔"

محمود نے گھبرا کر پوچھا "کیوں بھابی کیا ہوا۔ میں نے کون سا قصور کیا؟"

وہ بولی "کیوں میاں یہ تم دوا کہاں سے لاتے ہو؟ تم کو کس نے پیسے دیئے؟ تم دو مہینے سے جو میرا سارا خرچ اٹھائے ہوئے ہو تو یہ کیوں؟

سوال سخت تھا لیکن محمود گرگِ باراں دیدہ تھا۔ فوراً دروغ بافی کی۔ بولا "آپ یہ کیا فرما رہی ہیں۔ مجھ بیچارے کے پاس اتنے پیسے کہاں؟ بھائی صاحب جاتے وقت روپے دے گئے تھے، وہی خرچ ہو رہے ہیں۔ . . . کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔ آپ بتائیں میں لا دوں"

صفیہ نے چشمِ پرنم سے کہا "میں خوب سمجھتی ہوں۔ نہ اب وہ آئیں گے اور انھوں نے روپیہ دیا۔ آپ جی بھر کر جھوٹ بولئے"

محمود نے ذرا متین بن کر قسمیں کھانا شروع کیں، وہ چپ اُن کی صورت دیکھا کی۔ اصرار پر دوا بھی پی لی۔ جب جانے لگا۔ تو ایک خاص انداز سے پوچھا "آپ کو ان کا پتہ معلوم ہے؟"

ذرا سر کھجا کر بولا "نہیں . . . . لیکن مجھے یقین ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ دو تین روز میں ان کا خط آیا ہی چاہتا ہے"۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر منہ پھیر لیا۔ محمود نے پھر قسمیں کھانا شروع کر دیں "واللہ غلط نہیں ہو سکتا۔ بھابی اپنے سر کی قسم جو جھوٹ کہتا ہوں"

اس نے صرف ایک فقرہ کہا اور پھر نہ بولی "جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ تمہاری جان ایسی تمام چیزوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے"

محمود نے سیکڑوں بار اس طرح کے جملے سُنے تھے، لیکن صفیہ نے آج جس انداز سے یہ فقرہ کہا تھا اس نے اسے گونگا بنا دیا، وہ اپنے دلی ہیجان سے اس طرح گھبرایا کہ سوائے بھاگ آنے کے کوئی بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔

راستہ بھر دل میں نعیم کو کوستا رہا۔ دماغ صفیہ کے خوش کرنے کی صورتیں سوچتا رہا حکیم صاحب کی ملاقات نے اور پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔ وہ تانگہ پر کسی مریض کو دیکھنے جا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر تانگہ رکوایا اور قریب بُلا کر کہنے لگے "بھئی محمود میں جتنا ہی مریضہ کی حالت پر غور کرتا ہوں، اتنا ہی مجھے اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ وہ کسی کی محبت میں گھُلی جاتی ہے۔ وہ ان عورتوں میں سے ہے جن کی زندگی پیار محبت خوشی و مسرت پر منحصر ہے۔ اس کی جان اگر بچانا چاہتے ہو تو اُسے خوش کرنے کی فکر کرو ورنہ دوا بیکار ہے!"

حکیم صاحب تو یہ نسخہ بتا کر چل دیئے، لیکن غریب محمود کو یہ دوا ملے کہاں؟ خوشی نہ تو کسی عطار کے یہاں ملتی ہے اور نہ کسی "کیمسٹ ڈرگسٹ" کی دوکان پر۔ اعلاوہ بریں صفیہ کی خوشی صرف نعیم سے ملنے پر منحصر تھی۔ ان کا بلا لینا انسانی اختیار سے باہر۔ ہاں خط وسیلہ اور ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اسے کہاں بھیجا جائے؟ عجیب مصیبت تھی۔ دل و جان سے زیادہ قیمتی صفیہ موت سے روز بروز قریب تر ہوتی جاتی تھی اور محمود بے بس!

اسی اُدھیڑ بن میں بیڑی کے لئے جو جیب میں ہاتھ ڈالا تو بیڑی ندارد۔ پان والے کی دُوکان پر کچھ ایسے لفافے دکھائی دیئے۔ جن پر عراق و عرب کے ٹکٹ چسپاں تھے،

چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ بیڑی نہ خریدی بلکہ جیب کے سارے پیسے دوسرے دو کا نذار کی نذر کیئے اور بڑی خوشامدوں سے استعمال شدہ ٹکٹ خرید لائے۔

گھر پہونچ کر لکھنے کی کوشش ہونے لگی نعیم کے حرف سے حرف ملانے کی فکر علیحدہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے بارہ بجے تک نہ معلوم کتنے خط لکھے اور پھاڑے گئے۔ بالآخر ایک مسودہ ہر صورت سے پسند آیا اور اسی وقت لفافہ میں لکھ کر بند کیا گیا۔ پھر لفافہ خاک میں بھرا گیا تاکہ ایسا محسوس ہو کہ بہت دنوں کا چلا ہوا ہے اور بہت دور سے آیا ہے۔

صبح سویرے ہی صفیہ کے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اندر سے ماما نے پوچھا کون؟ وہ آواز بدل کر بولے "ڈاکیہ" اور جلدی سے لفافہ ڈیوڑھی میں پھینک کے بھاگ آیا۔ تھوڑی دیر میں متین و سنجیدہ بن کر گھر میں گیا۔ ماما نے خبر دی، میاں کا خط آیا ہے پھر کیا تھا صفیہ سے مٹھائی مانگنے لگا۔ "بس منہ میٹھا کیجیے۔ میں نہ کہتا تھا کہ خط آیا ہی چاہتا ہے!" وہ ذرا مسکرائی اور اس کے گال گلابی ہو گئے۔ محمود بھی بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ فقرے بھی چست ہوئے، جملوں کی روانی اور زبان کی طراری بھی عود کر آئی۔ بات بات پر ہنسی پھوٹ پڑی۔ اور موقع بے موقع دانت نکل پڑے۔ وہ مسکرا مسکرا کر سب کچھ سنا کی۔ جب محمود چلنے لگا تو بولی "اس خط میں کہیں پتہ نہیں لکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے؟"

اب کی پہلے ہی سوچے بیٹھا تھا۔ "ہاں ہاں" آپ خط لکھ ڈالیں میں بھیج دونگا

دوسرے دن صفیہ نے خط لکھ کر ایک سادہ لفافہ میں بند کر کے اسے دیا۔ اس نے ہنس کر کہا "بس اس خط کے پاتے ہی سرپٹ بھاگتے چلے آئیں گے۔ کیا مجال جو ایک منٹ رُکیں"

صفیہ نے محمود کی صورت مایوسی سے دیکھی اور منہ پھیر لیا۔ وہ بیٹھا تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی گپ لڑاتا رہا۔ پھر اُٹھ کر چلا آیا۔

گھر آکر اسی سوچ میں پڑ گیا۔ کہ اس خط کا کیا حشر کیا جائے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کھول کر پڑھ ڈالیں لیکن یہ خیال کہ اس میں نعیم سے اظہارِ محبت کے سوا اور لکھا ہی کیا ہوگا۔ مانع ہوا۔ علاوہ بریں دوسرے کے نام کا خط پڑھ لینا کوئی اچھی بات بھی نہ تھی۔ لہذا اسی طرح بند خط بستر کے نیچے پلنگ پر سرہانے کی طرف ڈال دیا گیا۔

دو تین روز عمداً جواب نہیں لکھا۔ پھر نعیم کی طرف سے جواب لکھا اور اسی طرح ڈاکیہ بن کر صفیہ کے مکان میں پھینک آیا۔ غرض اب خطوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے تو پوری زبان کا خیال اور دوسرے کے جذبات کی ترجمانی کا دھیان رہا ——————

لیکن چند خطوں کے بعد قلم بھاگنے لگا۔ نعیم کے نام سے خود اپنے دلی جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ موجوں کے تلاطم سے بند ٹوٹا۔ مہینوں سے جو درد دل میں چھپا تھا جس کے اظہار سے زبان جلتی تھی، وہ قلم نے صفحہ کاغذ پر خونِ جگر سے لکھنا شروع کر دیا، اور ہر خط میں "دل صد پارہ" کے لخت دکھائی دینے لگے۔

صفیہ نے بھی کئی ہفتہ خطوں کے لکھنے میں کوتاہی نہ کی۔ اور ہر خط کے جواب کا

انتظار بڑے اشتیاق سے کرتی۔ لیکن یہ عجیب بات محمود کو محسوس ہوئی کہ جب خط آتا تو اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا کہ جو بات اس نے پوچھی تھی اس کا جواب نہ ملا۔ جو چیز اُس نے مانگی تھی اُسے نہ ملی۔

ایک روز محمود سے کچھ شرمائی شرمائی کہنے لگی "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میں اپنے خیالات کا صحیح طور پر اظہار نہیں کر سکتی۔ ذرا آپ میرے خطوں کو دیکھ لیا کریں۔ ممکن ہے کہ زبان کی غلطیاں ہوں۔ آپ انھیں صحیح کر دیا کریں۔

یہ کہ کے اُس نے کھُلا ہوا لفافہ بڑھا دیا۔ محمود کے دل سے زہ ہُوا کہ وہ نعیم کے ساتھ اظہارِ عشق پر مشتمل خط پڑھے۔ اس نے بات بنائی اور ہنس کر کہا "بھابھی عشق و محبّت کی زبان لکھنؤ اور دلّی کے محاوروں کی پابند نہیں۔ وہ تو صرف و نحو، علم معنی و بیان سب کے قواعد سے کہیں بلند ہے۔ آپ کے دل کی نکلی ہوئی بات بھائی صاحب نہ سمجھیں، ناممکن ہے۔ بھلا اِس طرح کے خط پر بھی اصلاح دی جا سکتی ہے" یہ کہہ کر ہنسا اور لفافہ کے گوند لگے ہوئے حاشیوں کو نم کر کے چپکا دیا۔ صفیہ نے ایک لمبی سانس لی اور کروٹ لے کر منہ پھیر لیا۔

اس واقعہ کے بعد سے صفیہ کی ناطاقتی اتنی بڑھ گئی کہ وہ پھر بستر سے نہ اُٹھی۔ حرارت اور کھانسی میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی گئی۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہونچی کہ دن اور ساعت کا انتظار ہونے لگا۔

ایک دن علی الصباح جب محمود آیا تو اس نے قریب بلایا، بڑی حسرت سے

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے دیکھا کی۔ محمود، ہنسوڑ محمود، لاکھ ضبط کرنے پر رونے لگا۔ اس نے سر جھکانے کو اشارہ کیا۔ جب یہ بالکل منہ کے قریب کان لے گیا تو آہستہ سے بولی "روئیے نہیں، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ . . . اگر ہنستے رہیئے تو دم نکلنے میں . . . . . آسانی ہو!"

محمود نے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ صفیہ کا حکم تھا۔ کوئی مرچیں بھی آنکھوں میں لگا دیتا تو آنسو نہ نکلتے، خواہ مخواہ ہنسی بلائی گئی۔ لیکن وہ بھی روٹھے ہوئے بچّوں کی طرح آغوش لب تک مچل مچل کر آئی، مرنے والی بھی مسکرا دی، آنکھوں نے نہ معلوم کیا کیا ایک ہی نظر میں کہہ ڈالا۔ یکبارگی دیدے پھیلے اور پلکوں نے آہستہ آہستہ انھیں غلاف پوش کرنا شروع کیا۔ محمود کی ہنسی پھر بچّے کی طرح روٹھ گئی وہ گھبرا کر منہ کے قریب منہ لے جا کر دیکھنے لگا۔ لب لعلیں کھلے، ہلکی سی آواز آئی "پیارے . . . . . خط!"

پھر پھول کے سے ہاتھ پاؤں سوکھے پان کی طرح اکڑ گئے۔ جسم میں اس طرح کی حرکت ہوئی جیسے خزاں دیدہ پتیوں میں نسیم کے جھونکے سے ہوتی ہے، ایک منٹ بعد حباب دریا سے ہم آغوش ہو گیا! گلاب کی بو تند روش ہوا پر کہیں سے کہیں جا پہونچی، اور راشہب زمانہ کی اڑائی ہوئی گرد کا ذرّہ خاک نشین ہو گیا۔

محمود نے جب اپنا بہت سا اسا سہ رہن رکھکر صفیہ کے کفن دفن سے فراغت پائی۔ اور بیمار صد سالہ کی طرح نیم جان گھر پلٹا تو دروازے پر ڈاکیہ ملا۔ نعیم صاحب کا خط تھا، لکھا تھا۔

"پیارے محمود! صفیہ میری بیوی نہیں ہے۔ کلکتہ کی ایک یتیمہ تعلیم یافتہ پڑھی لکھی ہے۔ اپنی زندگی سے اس قدر عاجز تھی کہ میرے ساتھ لکھنؤ چلی آنے پر راضی ہوگئی میں جن صاحب کی عیادت کو ممبئی آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ عراق لیتے آئے۔ اگر ہو سکے تو تم صفیہ کے لئے کوئی بندوبست کردو۔ عورت بُری نہیں۔ نعیم"

محمود نے خط پڑھا۔ نعیم کو گالیاں دیں۔ اپنے کو بہت بیاکوسا اور دیوانہ وار پلنگ پر جاکر گر پڑا، دری کے نیچے کاغذات کھڑکھڑائے۔ صفیہ کے بند خطوط نکالے، انھیں ایک ایک کرکے گنا، تعداد میں سترہ تھے، خیال آیا، اس غریب کو دیکھو، کتنی محبت کرتی تھی۔ پھر بھی بیوفا لکھتا ہے۔ "عورت بُری نہیں" پھر آخر مجھ سے وعدہ کیوں لیا؟ پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا؟ ایسے بے وفا کے ساتھ اس طرح کی محبت۔ معلوم ہوا، خط کی جگہ ہاتھوں میں چنگاریاں ہیں۔ انگلیاں جلنے لگیں۔ جھلا کر خط چاک کرنے لگے۔ پہلا ہی خط وہ تھا جسے صفیہ نے سب سے آخر میں دیا تھا اور جس کے پڑھ لینے پر مُصر تھی، کاغذ کے دو ٹکڑے ہوکر جب زمین پر گرے تو ایک سطر پر نظر پڑی۔ لکھا تھا۔ "مجھے نعیم سے محبت نہیں ہے۔" حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کانپتے ہاتھوں سے دونوں ٹکڑے اُٹھا لئے۔ شروع سے آخر تک پورا خط پڑھ ڈالا۔ نعیم کی جگہ اپنی فردِ جرم نکلی۔ صفیہ نے صاف صاف اقرار کیا تھا کہ وہ نعیم سے محبت نہیں کرتی تھی، بلکہ اس دیوانے محمود سے! اور اسی کی محبت میں جان دے رہی تھی! جلدی جلدی سارے خط پڑھ ڈالے۔ سب میں اپنی دکھ بھری داستان بیان کی تھی۔ کسمپرسی کی یتیمانہ زندگی، متمول عزیزوں کا کنیزوں سے بدتر برتاؤ، نعیم صاحب سے اتفاقیہ ملاقات،

ان کی چکنی چپڑی باتیں، ان کا دھوکا، پھر محمود سے اقرارِ محبت۔ عورت تھی سب کچھ جانتی اور سمجھتی تھی۔ یہ دوست کی پاسداری میں اس کے خطوط پڑھ لینا حرام جانتے۔ وہاں جواب نہ ملنے سے اضمحلال بڑھتا، حرارت بڑھتی، خوشی اس کی زندگی تھی وہ نہ ملی تو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر "خط! خط!" کہتی دنیا سے سدھاری!

محمود کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ اس نے دیوانہ وار قمیص کا گریبان ہاتھ میں پکڑا اور اتنا سخت جھٹکا دیا کہ دامن تک چاک ہوگیا۔ پھر مینا کی طرح بہ یک وقت ہنستا اور روتا گھر سے نکل گیا۔ تین دن اور رات نہ معلوم کہاں کہاں مارا مارا پھرا، چوتھے روز بڑی تلاش کے بعد صفیہ کی تازہ قبر پر بیٹھا دکھائی دیا۔ کبھی روتا تھا، کبھی ہنستا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر مولانا ئے بیخود کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

امتحانِ قدرتت خواہم درایجادِ عذاب
دستِ من رنگیں زخونِ قلب و خونِ دلبر است!

شکار یا شکاری

ہم تینوں آدمی گاؤں سے باہر جانے کے قصد سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے تھے، جاڑوں کا زمانہ تھا، پاس والی جھیل میں چڑیاں بڑی کثرت سے گرتی تھیں خیال تھا کہ دو گھنٹے کے شکار میں بیس پچیس سرخاب اور دوسری چڑیاں اگر ہاتھ آگئیں تو صبح کی سیر و تفریح کے ساتھ شام کے کبابوں کا مفت انتظام ہو جائیگا۔

وقت بھی وہ تھا جب دیہی دیویاں پیتل کے لوٹے دست سیمیں میں لئے ایک خاص انداز سے شرماتی، جھجکتی، گھونگھٹ نکالتی، بدن چراتی جنگلوں سے پلٹتی دکھائی دیتی تھیں - ان کی ملگجی ساری، اُن کے خمار آلود چہرے، اور کسی جانے پہچانے مرد کو دیکھ کر ان کا آپس کا معصومانہ ٹھٹول اور پر ترنم قہقہہ ویسا ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔

جیسا کہ شبنم سے بھیگے اور ہلکے سے کہرے سے ڈھکے ہوئے درختوں پر رہنے والی چڑیوں کا اپنے اپنے گھونسلوں کے قریب چہچہانا۔ اس سہانی فضا میں کبھی کسی کسان کے گھر سے بیلوں کو کھول کر کھیتوں کی طرف لے چلنے کے لیے "للکارنے" کی آواز آرہی تھی تو کبھی کسی امیر کے کھونٹے سے بندھے ہوئے بچھڑے کے بولنے کی ..... اور ہم لوگ بندوقیں کندھوں پر رکھے کارتوسوں کی پیٹیاں گردنوں میں لٹکائے، ہنستے، فقرے کستے، چلے جارہے تھے۔

زمین نم تھی، سبزہ بھیگا ہوا تھا، ہوا ٹھنڈی تھی اور سامنے سیاہی مائل دھندلے دھندلے کھیت تھے۔ معلوم ہوتا تھا ہم خود نہیں جارہے ہیں بلکہ فضا کی موسیقیت ہمیں اپنے نہ تھکنے والے دھارے میں بہائے لیے جارہی ہے۔ نہ تکان تھا۔ نہ کسل تھی، اور نہ پیدل چلنے میں کسی قسم کی کوئی اذیت۔ گویا ہم اپنے پیروں اور ٹانگوں کے سہارے نہیں چل رہے تھے۔ بلکہ جوانی، بے فکری، اور سرشاری کے دوش پر سوار تھے!

ہم نے گاؤں کے باہر کے کھیتوں کو طے کر کے لچھمی پور کا رُخ کیا۔ اب کھیتوں کی حالت بدل گئی گاؤں سے متصل مزرعہ حصہ مسطح تھا۔ یہ کھیت "دھنکر" تھے۔ اور برسات میں پانی سے بھر جایا کرتے تھے۔ ان میں دھان ہوتا تھا۔ اسی لئے ان کی زمین ناہموار تھی، مسطح کھیتوں میں ہمارے پاؤں برابر پڑتے تھے۔ اب ہم اس طرح چلنے لگے تھے۔ جس طرح بدمست شرابی چلتے ہیں۔

مگر فضا نے اس ناہموار حرکت کو اسی قدر خوشگوار بنا دیا تھا جس قدر کہ جھولے کے

ہچکولے ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم بڑھے چلے جا رہے تھے۔ خوش ہوتے چلے جا رہے تھے۔

آفتاب کے اچھالے ہوئے گلال نے مشرقی افق کے دامن کو رنگ دیا، سبزاور کاہی چیزوں پر بھی ہلکی سرخی دوڑ گئی۔ کہرے میں بنفشی چمک پیدا ہوئی اور راستہ ذرا صاف دکھائی دینے لگا۔ ہم نے قدم تیز کیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تیز کیے۔ خیال تھا ہمارے پہنچنے سے پہلے چڑیاں آکر چپٹ نہ جائیں۔

لچھمی پور نصف میل پر تھا۔ جھیل ایک فرلانگ سے کم پر تھی۔ آبی چڑیوں کا شور سنائی دینے لگا۔ کہ اپلوں کے ٹوکرے سروں پہ رکھے دو عورتیں آتی دکھائی دیں۔ ایک جوان اور ایک بوڑھی، جوان عورت کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور پیٹ نکلا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت میانے قد کی دبلی پتلی تھی۔ چہرے کو جھریوں نے سوکھے ہوئے آم کی قطع کا بنا دیا تھا مگر چال میں بلا کی سرعت تھی۔ وہ بار بار جوان عورت کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتی اور اُسے ہر بار رُک کر ساتھ والی کو ہمت دلانا اور پکارنا پڑتا تھا۔

ہونے والی ماں آہستہ آہستہ تھوڑی دور چلتی لڑکھڑاتی، تھمتی اور اپلوں سے بھرا ہوا ارہر کا بڑا ٹوکرا ایک ہاتھ سے سنبھالتی، دوسرے سے پیٹ پکڑتی۔ پھر دو چار قدم چلتی، پھر رک جاتی تھی۔ جب بوڑھی عورت اُسے پکارتی تو وہ ذرا سا جھک کر آگے بڑھتی اور اُس کے برابر آجاتی تھی۔ دس بارہ قدم دونوں برابر چلتیں۔ پھر مُسن آگے اور کمسن پیچھے ہو جاتی۔ گویا یہ روزانہ کا منجھا ہوا راستہ نہ تھا، بلکہ دنیاوی زندگی کی کا وہ اک راہ تھی جس میں بڑے چھوٹوں کو اور بوڑھے جوانوں کو راستہ دکھاتے، ہمت دلاتے چلتے ہیں۔

ہم اس سماں کو دیکھتے جاتے تھے۔ اور اُن سے قریب ہوتے جاتے تھے۔ ہماری آپس میں باتیں خاموشی سے بدل گئی تھیں۔ ہماری ہنسی بالکل مفقود ہو گئی تھی ہمارے قدم آہستہ آہستہ پڑ رہے تھے اور ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر کچھ سوچنے لگا تھا۔

ہمارے برابر آتے ہی جوان اہیرن نے سر سے کھسکی ہوئی ساری کا آنچل کھینچکر گھونگھٹ نکالنے کی کوشش کی اور آہ کر کے بیٹھتے بیٹھتے گر پڑی۔ جھوّا ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اُپلے بکھر گئے۔ ہم ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنی بندوق احمد کو دے دی اور جلدی جلدی اُپلے سمیٹ کر جھوے میں رکھنا شروع کر دیئے۔

ہونے والی ماں کی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے جھلک رہے تھے وہ خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی نظروں سے پلٹتی ہوئی بوڑھی عورت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اُس نے پاس آکر پوچھا "کاہے رے؟"

جوان عورت رُک رُک کر بولی "اب۔ نا۔ چلا۔ جات ہے!"

دوسری اہیرن اُس کی بغل میں بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے جھوا سر سے اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے لپک کر سہارا دیا۔ ٹوکرا اتار کر علیحدہ رکھ دیا گیا۔

جوان عورت نے کراہ کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ پھر سمیٹ لیں۔ بوڑھی اہیرن نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم بڑے بڑے دیدے نکالے گھور گھور کر اس سماں کو دیکھ رہے تھے۔

"وہ جھڑکنے والے لہجے میں بولی" ایہاں سے ہٹ جاؤو!"

ہم لوگ شرمندہ و خجل آگے بڑھے ابھی دو چار ہی قدم گئے ہونگے کہ کراہتی ہوئی عورت نے کہا۔ "ٹھہر، ٹھہر!"

میں نے پلٹ کر پوچھا "کہاں ، چھیدی پور میں؟" بوڑھی عورت بولی "ہاں ، سکھو اہیر کے یہاں!" میں نے احمد سے اپنی بندوق لے لی۔ ان سے اور اشہر سے کہا کہ چھیدی پور سے سکھو کو بلا لائیں۔ ان دونوں نے میری صورت دیکھی۔ سرمایہ داری کی گود میں پلے ہوئے زمینداروں کے لڑکے شکار کھیلنے نکلے تھے۔ نہ کہ رعایا پرجا کی زچگی میں ہاتھ بٹانے!

میں نے کہا "جاؤ بھی ، خدمت ہی میں عزت ہے!"

وہ مسکرائے مگر خاموش چھیدی پور کی طرف لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے روانہ ہو گئے میں اہیرنوں کی طرف پشت کر کے دور کے ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا......

سورج کی پہلی کرن نے اوس کے ہر قطرے کو موتی کی طرح چمکا دیا ، ایک چڑیا پاس والے درخت پر کھیت سے اڑ کر گھونسلے میں آئی اور بچوں کو دانہ بھرانے لگی ، لچھمی پور کے مندر کے گھنٹوں کے بجنے کی آواز ہلکی ہلکی سنائی دی۔ جوان اہیرن زور سے چیخی ، "کہاں کہاں ، کہاں" کی خوش آئند صدا پیدا ہوئی اور بوڑھی عورت نے جھپٹ کر ایک بچہ گود میں اٹھا لیا۔

اُس نے مجھے پکارا "بھیا چاقو!"

میں نے تھوڑی دور آگے بڑھ کر اپنا شکاری چاقو اُس کی طرف پھینک دیا۔

چند منٹ بعد پھر اُس نے پکارا "بھیا ، یہاں آؤ!" میں رُکتا جھجکتا ادھر بڑھا

ماں نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ بوڑھی عورت بچہ کا منہ اپنے آنچل سے پونچھتی چند قدم آگے آئی اور اُسے میری طرف بڑھا کر بولی!

"اِہ کا جھیل ماں نہلا دو!"

میں نے بندوق زمین پر رکھدی اور بچہ کو ہاتھوں میں لے لیا۔

ماں نے جلدی سے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کہا "ناہیں! ناہیں!"

میں ٹھٹکا۔ دایہ جھڑک کر بولی۔

"اہکا لیے دو! تم اہکا دھولا دو!"

مجھے بڑی گھن معلوم ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اس چیختے ہوتے گوشت کے لوتھڑے کو وہیں زمین پر پھینک دوں، مگر خیال آیا امانت ہے۔ دل پر جبر کیا اور اُسے شیشے کے برتنوں کی طرح سنبھالتا ہوا چل کھڑا ہوا۔

جھیل کے کنارے پہنچا۔ وہاں آبی چڑیوں کا میلا لگا تھا۔ کچھ اڑ رہی تھیں اور کچھ آپس میں لڑ رہی تھیں۔ میں نے حسرت سے اُن پر نظر ڈالی، پھر اپنے ہاتھوں پر۔ اوہاں بندوق کی جگہ بچہ تھا۔ زندگیاں ختم کرنے والے آلے کی جگہ زندگیاں قائم رکھنے کی ایک نئی مشین۔

میں نے بچے کو دھویا۔ وہ برابر چیختا رہا۔ مگر جب میں نے اُس کا جسم اپنے ریشمی رومال سے پونچھ ڈالا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اور اُس نے اپنی جلد جلد جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اُس بے بسی کے دیکھنے نے میرے دل میں ایک ایسی عجیب کیفیت پیدا کر دی کہ میں نے جھک کر اس اہیر کے لونڈے کی پیشانی چوم لی!

میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ میری اس وقتی کمزوری کا دیکھنے والا کوئی انسان نہ تھا۔ چڑیاں تھیں، پر کھجاتی ہوئی، شور مچاتی ہوئی، لڑتی ہوئی، اور مچھلیاں پکڑتی ہوئی!

میں تیز قدم رکھتا ہوا بچہ کو سینے سے لگائے پلٹا۔ زچہ تڑپ اور کراہ رہی تھی، بوڑھی اہیرن اس سے کہہ رہی تھی " ارے ڈرمت! اولاوت ہن!"

مجھے دیکھتے ہی اس نے بچے کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ماں بھی مسکرادی، اُس کا چہرا اُس طرح چمک رہا تھا، جس طرح آئینہ آفتاب کے سامنے رکھ دینے سے چمک اُٹھتا ہے میں مامتا کی اس ضوفشانی کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے امانت جلدی سے واپس کر دی اور اپنی بندوق اٹھا کر پچھلی مینڈھ کی طرف پلٹ آیا۔

چھیدی پور کی طرف سے لوگوں کے پکارنے کی آوازیں سنائی دیں اور کچھ لوگ دوڑتے ہوتے آتے دکھائی دیئے۔ تھوڑی دیر میں چار اہیر ایک ڈولی لیے ہوئے آپہنچے۔ اور اُنکے پیچھے پیچھے احمد وا شہر۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا " سکھو کون ہے؟" ایک جوان ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ پیشانی پسینے سے تر تھی اور آنکھوں میں خوف تھا۔

میں نے مسکرا کر کہا " بیٹا مبارک!"

دفعتہً اُس کے چہرے پر بالکل اسی طرح سرخی دوڑ گئی جس طرح ابھی کچھ دیر قبل اوس سے بھیگے ہوئے سبزے پر آفتاب کی سنہری کرنیں دوڑ رہی تھیں۔ اُس نے جھر جھری سی لی، پھر وہ میرے قدم چھونے کے لئے جھک گیا میں نے روکتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا کرتا ہے! جا! ادھر جا! اپنے بچے اور بیوی کو دیکھ!"

وہ مسکراتا ہوا ادھر بڑھا جدھر اس کی شریک زندگی کو دوسرے اہیر بوڑھی اہیرن کی مدد سے ڈولی میں لٹا چکے تھے۔ سکھو نے لپک کر بچے کو گود میں لے لیا دو اہیروں نے ڈولی اٹھائی۔ بوڑھی اہیرن نے اپنا اپلوں کا ٹوکرا سنبھالا اور چوتھے اہیر نے زچہ کا جھوا سر پہ رکھ لیا۔

جب یہ قافلہ ہمارے برابر پہنچا تو میں نے احمد اور اشہر کی جانب دیکھا اور انہوں نے میری طرف۔ ہم نے اپنی بندوقوں میں کارتوس بھرے اور ایک بار تینوں آدمیوں نے ہوائی فیر کر دیئے!

زچہ ڈولی میں لیٹی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے تھی اس نے اس فیر پر منہ سے ہاتھ ہٹا لیئے۔ ہماری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ ہم بندوقیں سیدھی کر کے اسی طرح کھڑے ہو گئے، جس طرح بڑے افسروں کو معمولی سپاہی سلامی دیتے ہیں۔

احمد سے خاموش نہ رہا گیا۔ مسکرا کر بولا "ارے ہمیں بھولنا نہیں جب اس لونڈے کا کوئی کام کرنا تو ہمیں بھی بلانا۔ اب ہم بھی اس کے آدھے باپ ہیں۔"

سکھو مسکرا دیا۔ بوڑھی عورت زچہ کی طرف سے بولی "جرور! جرور!"

جب یہ قافلہ آگے بڑھ گیا تو ہم نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا، جھیل کی جانب نظر کی اور تینوں آدمیوں نے ایک ساتھ اپنی اپنی گردن ہلائی۔

میں نے کہا "بس آج کا شکار ہو چکا!"

احمد بولا" اور کیسا کچھ شکار! انسانی زندگی کا شکار!"

میں نے کہا" نہ جانے شکار ہے یا شکاری!" احمد نے رجائی آواز میں کہا" ہمارا ہاتھ لگا ہے کہ کوئی مذاق ہے! اللہ نے چاہا تو معمولی شکاری نہ ہوگا! یزداں گیر!"

میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا" ہاں یزداں گیری ہی کے سامان تو ہیں! اپلونکا بھوا! دھنکر میں پیدائش اور جھیل میں غسل!"

احمد بحث کرنے کے انداز میں بولا" اس سے کیا ہوتا ہے، روح اللہ بھی تو اصطبل میں پیدا ہوئے تھے!"

اشہر ابھی تک خاموش تھا۔ جھڑک کے بولا" میاں احمد تمہاری اور مجید کی یہی باتیں تو مجھے ناپسند ہیں۔ ایک معمولی اہیرن نے، ایک کالا سا لونڈا دھنکر میں لیے ڈھوتے ہوئے جنا اور تم دونوں اس میں طرح طرح کے معنی پہنانے لگے۔ روح اللہ، خلیل اللہ اور خدا جانے کن کن بزرگوں سے مثالیں دیکر ایک تکلیف دہ واقعہ کو خوش آئند صورت میں پیش کرنا۔ ۔ ۔ تم دونوں کا خاص حصّہ ہے!"

احمد نے کہا" اجی آخر اُسے تکلیف دہ سمجھئے ہی کیوں؟"

اس نے اسی تیور سے کہا" اس لئے کہ تم میں اب اس غربت کے احساس کا مادہ بھی نہیں رہ گیا جو اس طرح کے واقعات کا سبب ہے۔ تمہیں یہ نہیں سجھائی دیتا کہ ہندوستان کی غربت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس طرح کی حالت میں بھی عورتیں جفاکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ میں نے سکھو سے پوچھا اسے ایسی حالت میں کیوں چلنے دیا

وہ سر جھکا کر بولا، "کا کریں بھیا، گھر ماں کوئی پیسہ نا رہا۔ اُدکھس لا دو، اپلا بیچ لائیں، دو چار آنہ مل جائے تو سیو رماں کام آئی"

میرا اور احمد کا سر جھک گیا۔

دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ زمین سوکھی جا رہی تھی، درخت اور سبزے سے شادابی غائب ہو رہی تھی، اور گاؤں کے قریب مطلع پر غبار سا چھایا ہوا تھا!!

خوش قسمت لڑکا

بوڑھی رحیمن ننھے حمید کا ہاتھ پکڑے گھر سے نکلی، دادی کے سوکھے ہاتھوں میں پوتے کی نرم نرم انگلیاں اس طرح تھیں جیسے خزاں دیدہ پتوں میں نومیدہ کونپل! رحیمن کی کمر جھکی ہوئی تھی، چہرے پر جھریاں پڑی تھیں، آنکھوں کے گرد باریک باریک نشانات تھے، گال دانتوں کے نہ ہونے سے پچکے ہوئے تھے، ٹھوڑی قریب قریب ندارد تھی، پاؤں کانپتے ہوئے پڑتے تھے، عصا کا سہارا لینا ضروری محسوس ہوتا تھا، پھٹا سا برقعہ جسم پہ تھا، اس کا نچلا حصہ کیچڑ میں اٹا ہوا تھا، پاؤں میں پرانی وضع کی پیوند دار جوتی تھی۔

ننھا حمید سر جھکائے ساتھ تھا، آواز بھرائی ہوئی، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی اور چہرے اور پھٹے کپڑوں سے بلا کی حسرت برستی ہوئی!

ضعیفہ نے کہا "بیٹے آٹھ نو برس کے سن میں نوکری بڑی قسمتوں سے ملتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ بڑھیا کی فریاد سن لی، دیکھو خدا کا شکر ضرور ادا کرنا۔"

حمید نے گردن جھکائے ہوئے کہا "جی ہاں دادی اماں" ضعیفہ بولی "اور بیٹا اب کے میلے میں تم اپنے لئے ایک چار پیسے والی ٹوپی خرید لینا۔ تم ماشاءاللہ اب نوکر ہو گئے ہو!"

حمید نے پچھلے ہی انداز سے کہا "بہت اچھا دادی اماں!"

بڑھیا بولی "اور دیکھو بیٹے یہ جو تم کھٹ پٹی اس وقت پہنے ہو۔ اسے اتار کے رکھ لینا اسے عید بقرعید میں پہننا اب تم سمجھ دار ہو" آگم "کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ایسے ویسے دنوں میں ننگے پاؤں چلنے میں کوئی حرج نہیں کھٹ پٹی رہے گی تو تیج تہوار کے دنوں سب کے ساتھ تم بھی کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتے چلو گے۔"

حمید کی جھکی گردن اور جھک گئی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "بہت خوب دادی اماں"

صبح کا وقت تھا، پو پھٹ چکی تھی، مرغ بانگ دینا بند کر چکے تھے۔ مسجدوں سے تہلیل و تسبیح اور مندروں سے ناقوس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دیہاتی عورتیں، دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ہاتھوں میں لوٹا لئے، گھونگھٹ نکالے، گھروں کی طرف پلٹتیں، راہ میں ملتی جاتی تھیں۔ ہر ایک رحیمن اور اس کے پوتے کو جاتا دیکھتیں مگر راستہ کھوٹا ہونے کے وہم سے منہ سے کچھ نہ بولتیں۔ ہاں ان دونوں پر بار بار پلٹ کے حسرت کی نظر ضرور ڈالتی تھی۔

یہ دونوں کھیتوں کے کنارے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ بوڑھی حمین چھوٹے حمید کو ملازمت کے فرائض، آقا و ملازم کے تعلقات، خدا کے اپنے بندوں پر احسانات، چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمجھا کے خاموش ہو چکی تھی، حمید نے سب کچھ سن لیا تھا اور دادی کے ہر سوال پر یہی جواب دیا تھا" جی ہاں دادی اماں" " بہت خوب دادی اماں" لیکن جب وہ ساری باتوں کو سننے کے بعد گردن اٹھا کر دیکھتا تو راستہ سامنے ویسا ہی چمکتا ہوا دکھائی دیتا، اور منزل کا کوسوں پتہ نشان نہ ملتا!

آفتاب نے اپنے سنہری سہرے کے اندر سے جھانکنا شروع کیا۔ دیہاتی بیلوں کو ہنکاتے ہل کندھوں پر رکھے، کھیتوں میں دکھائی دینے لگے۔ کوئی گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوئی بیلوں کو ہنکاتا ہوا اور کوئی جنگل سے پلٹتی ہوئی دیویوں سے ہنسی ٹھٹھول کرتا ہوا۔ اہیر کے لڑکے گاؤں بھر کے مویشی میدانوں میں چرائی کے لئے اکٹھا کر رہے تھے" گڈریئے بھیڑوں کا گلا ہنکاتے " ہرے! ہرے! اُرا! اُرا!" کرتے چلے جا رہے تھے۔ ضعیفہ اور حمید بھی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جا رہے تھے، اُن کے سامنے راستہ دور تک زرد زرد چمک رہا تھا، لیکن منزل کا دھندلا خاکہ بھی نہ دکھائی دیتا!

سامنے سے منگو چمار آتا ہوا دکھائی دیا۔ کاندھے پر لاٹھی تھی۔ اس میں نیا جوتا لٹکا ہوا تھا، سر پر چھوٹی سی پگڑی تھی۔ جسم میں ایک مارکین کا کرتا اور ٹانگوں میں زرد رنگی ہوئی دھوتی پہنے تھا۔ وہ گنگناتا مسکراتا چلا آ رہا تھا۔ بڑی بی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ بولا" کہاں جات ہو کھالا؟" (کہاں جاتی ہو خالہ؟)

ضعیفہ بولی "گشائیں پور بھیا۔ وہاں حمید کا کام لگ گیا ہے" وہ سادگی سے بولا

"ارے کھالا! ای سن ماں اور کام! ای کھیلنے کا سن دِن ہے نا کی کام کا!؟" (ارے خالہ اس

سن میں اور کام۔ یہ کھیلنے کا سن دن ہے نہ کہ کام کا)

ضعیفہ نے اس کے سوال کے جواب میں صرف اتنا کہا "ہاں بھیا، پر میرے گھر سوائے

اس کے اور کوئی مرد نہیں" پھر پوچھا، "تم کہاں سے آرہے ہو؟"

وہ کچھ شرماتا ہوا مسکرایا، "سسرال سے!"

حمید نے دادی کی انگلیاں کھینچیں، اس نے سر اٹھا کر دیکھا، راستہ سامنے تھا گشائیں کچھ

کوسوں دور۔ بس چلنے لگے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلے جا رہے تھے اور منزل کا پتہ نہیں!

آگے بڑھ کے مولوی صاحب ملے فینس نیم کے درخت کے نیچے رکھی تھی، آٹھ کہار قریب

ہی ذرا سستا رہے تھے۔ خاں صاحب کے بیٹے کا مکتب تھا، مولوی صاحب بسم اللہ کرانے

جا رہے تھے۔ بڑی بی کو دیکھ کے بولے۔

"ایں رحیمن! یہ تم کہاں اتنے سویرے جا رہی ہو؟"

ضعیفہ نے سلام کر کے کہا "جی اس بچے کو کام پر لگانے جا رہی ہوں!"

مولوی صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "ہوں! ماشاء اللہ! اتنے سے سن میں

کمانے جا رہا ہے۔ خوب! بہت خوب! اگر تم نے اسے نماز سکھا دی ہے؟"

ضعیفہ کے زرد چہرے پہ سرخی آگئی، بولی "جی ہاں! مولوی صاحب میں نے اسے نماز

خود سکھائی ہے، ہم غریب بھی خدا کا نام لینا جانتے ہیں۔

مولوی صاحب نے سٹ پٹا کے نہیں! نہیں! ہاں! ہاں! ماشاء اللہ" کہا اور دونوں مسافر آگے بڑھ گئے۔ ایک بوڑھا ایک بالا۔ ایک عمر کی حدیں ختم کئے ہوئے دوسرا زندگی میں قدم رکھتا ہوا۔ دونوں کے پاؤں میں رعشہ، دونوں کے گھٹنے کمزور، ایک کا کثرت کار سے، دوسرے کا ناکردہ کاری سے لیکن معذور و مجبور چلے جا رہے تھے، آفتاب کی حدت بڑھتی جاتی تھی، منزل کوسوں دور تھی، لاپتہ تھی، مگر قدم نہ رکتے تھے!

گوشائیں پور کی مفصلات شروع ہوئیں، پختہ مکانات، سر بفلک عمارتیں دکھائی دینے لگیں شہر کے پھاٹک سے ملا ہوا آموں کے درخت کے قریب ایک اندھا فقیر بیٹھا تھا "ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا، ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا"، اندھے فقیر کا سوال اندھے فقیر کا سوال، کی رٹ لگی تھی۔ اس کے زرد زرد دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کی میلی داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اور اسکی آنکھوں میں دیدوں کی جگہ کیچڑ بھری ہوئی تھی، اس نے ان تھکے مسافروں کے پاؤں کی چاپ سنتے ہی ان کی طرف رُخ کیا اپنا سوکھا ہوا زرد ہاتھ پھیلا دیا "بابا بھلا ہوگا! اندھے سورکا سوال! ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا!"

ضعیفہ نے پوتے کا ہاتھ مضبوط تھام لیا۔ فقیر کے قریب جا کر بولی "بابا ہم نے سنا تھا تمہیں ایک لڑکا نوکر چاہیئے!"

فقیر کے لب و لہجہ میں فرق آگیا۔ پہلے عاجزی تھی اب حکومت، وہ بولا "تم لائی ہو؟" اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ بڑھیا نے حمید کو اسکے قریب کر کے کہا "ہاں دیکھو، ماشاء اللہ نواں سال ہے!"

اندھے بھکاری نے حمید کو سر سے پاؤں تک اس طرح ٹٹولا جس طرح قصاب بکری کو دام چکاتے وقت ٹٹولتا ہے۔ پھر بولا "ہاں مضبوط معلوم ہوتا ہے، کیا نام ہے؟"

بچے نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "حمید!"

اندھے نے پوچھا "تم مجھے سہارا دیکر گاؤں گاؤں لے چلو گے؟"

ننھے حمید نے گرفتہ آواز میں کہا "جی ہاں"

اندھے نے پھر پوچھا "تم مرے ساتھ گا سکو گے؟"

لڑکے نے چھوٹی سی زبان سوکھے ہونٹوں پر پھر کے کہا "جی، آپ اگر سکھا دینگے۔"

اندھے نے چھوٹی سی پیٹی اور لکڑی اٹھالی۔ وہ بچے کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر کھڑا ہو گیا۔

پھر بولا "آؤ چلیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں ملتا۔ چلو پھیری لگائیں۔!"

حمید نے دادی کو حسرت سے دیکھا پھر سڑک پر نظر کی، بہت دور تک سپید سپید چمکتی ہوئی چلی جارہی تھی، نہ رکنے کا موقعہ نہ ٹھہرنے کی جگہ اور نہ پناہ کا مقام! منزل کوسوں دور تھی! بالکل لاپتہ تھی!

وہ اندھے کے آگے چلنے لگا۔ اس کا ایک سوکھا ہاتھ بچے کے کاندھے پر تھا اور وہ اسکے ساتھ صدا لگا رہا تھا "دیدے بابا دیدے! ایک ہے اندھا ایک ہے بچہ! ایک ہی پیسہ! پاؤ بھر آٹا، دیدے بابا دیدے بابا!" ایک کی آواز میں خشونت تھی، دوسرے کی آواز میں رقت! ایک اپنا حق مانگ رہا تھا دوسرا اپنی حق تلفی کا ماتم کر رہا تھا!

رحیمن دیر تک اپنی کمزور آنکھوں سے پوتے کی غائب ہوتی ہوئی صورت دیکھتی رہی، پھر اپنے دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی آسمان کی طرف دیکھ کر بولی "تیرا شکر ہے مرے مالک! تو نے مرے بچے کو اتنا خوش قسمت بنایا کہ وہ نویں ہی برس کام پر لگ گیا!" (ماخوذ)

حقِ نمک

راجے چھ برس کا تھا جب ٹھاکر صاحب نے اُسے پانچ روپیہ پر مول لیا سنہ ۳۴ء کے زلزلے میں اس کا گھر کا گھر صاف ہو گیا تھا۔ ماں باپ، بھائی بہن سب کے سب گرتے ہوئے گھر کی قبر میں زندہ دفن ہو گئے تھے۔ وہ اتفاق سے اس وقت گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ مویشی چرانے گیا تھا۔ یہاں فرشتوں نے زمین کو جھولا بنا کر دو چار ٹیڑھی ترچھی پینگیں لیں۔ اور اُن کے تین چار منٹ کے کھیل نے سینکڑوں بنے گھر گرائے اور ہزاروں بسے گھر اجاڑ دیئے۔ راجے جب گھر پلٹا تو اُس نے وہ سماں دیکھا کہ شاید اگر زیادہ سمجھ ہوتی تو وہ پاگل ہو گیا ہوتا۔ مگر بچہ ہی تو تھا، وہ اپنے بھائی بہنوں اور ماں باپ کو نہ پا کر تھوڑا سا رو دیا، گلگلایا اور پیٹ بھرنے کی فکر میں لگ گیا، مگر گاؤں میں جتنے

لوگ بچ گئے تھے سب اسی فکر میں گرفتار تھے۔ گھر کی بربادی مرنے والوں کا سوگ اور بھوک کی دوری نہ ہونے والی تکلیف ہر ایک کے لئے یکساں تھی۔ دوسرے گاؤں تک پہنچنا بھی مشکل ہی تھا۔ زمین جگہ جگہ سے میلوں تک گگڑی کی طرح پھٹ گئی تھی اور کوس بھر کے فاصلہ پر بہنے والے دریا کے پانی نے بھاگلپور ضلع کے اس گاؤں کو اچھا خاصا ایک جزیرہ بنا دیا تھا۔ راجے اور سارے گاؤں کو پورے دو دن پانی کے اس محاصرہ میں بھوکا رہنا پڑا۔ تیسرے دن آس پاس کے لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر آئے اور انھوں نے بڑی کوششوں سے ان لوگوں کی جان بچائی۔ . . . . اسی نفسی نفسی کے عالم میں گاؤں کے ایک پاجی نے، جس کی رسی دراز تھی، اس بچے کو اپنا لیا اور تین چار دن کے بعد اسے ٹھاکر صاحب کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

ٹھاکر صاحب قانون سے واقف تھے، جانتے تھے کہ انسانوں کا بیچنا اور خریدنا اب برطانوی ہندوستان میں جرم ہے، لیکن ان کے خاندان میں زمینداری اس سمے سے چلی آتی تھی، جب پٹھان اور مغل بھی ہندوستان میں نہ آئے تھے اور اُن کے پرکھے سینکڑوں داس اور داسیوں کے بغیر ایک قدم بھی چلنا گوارا نہ کرتے تھے، اس لئے ان کے سامنے یہ سوال کوئی اخلاقی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ نیچ قوموں کے لوگ ٹھاکروں اور برہمنوں کی سیوا کے لئے بنائے ہی گئے ہیں۔ یہ تو برہما کے پاؤں سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان کا کام تو ٹھوکریں کھانا اور جوتیاں سیدھی کرنا ہی ہے، رہی سرکار کی طرف سے پوچھ گچھ، سو اس کا کوئی ڈر نہ تھا، کہار مہریاں

گھر میں تھیں ان میں سے ہر ایک کو پولیس آنے پر اس بچے کا دعویدار بنایا جا سکتا تھا چنانچہ اُنھوں نے راجے کو بے کھٹکے مول لے لیا۔ اُن کو اس زمانے میں اسی سن و سال کے ایک لڑکے کی تلاش تھی بھی۔ ان کا تین برس کا ہیرا، ایک تو بچپن سے ہی کچھ اعضا بیکار لیکر پیدا ہؤا تھا۔ مگر پچھلے چھ مہینہ میں تو وہ طرح طرح کی بیماریوں کا ایسا شکار رہؤا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہوگئی تھیں۔ اب اس کے لئے ایک مستقل سواری کی ضرورت تھی۔ وہ بھی کسی جانور کی نہیں۔ ہیرا نا سمجھ تھا۔ سواری کو سمجھدار ہونا چاہیے تھا، اس کے لئے ایک لڑکا سب سے زیادہ موزوں تھا۔ کوئی چھوکرا نوکر رکھا جا سکتا تھا۔ دنیا میں ہر طرح کی خدمت چند پیسوں میں خریدی جا سکتی ہے، لیکن اگر کوئی جان ہی چند روپوں میں مل جائے، تو اس سے بہتر کیا صورت ہو سکتی تھی! چنانچہ راجے خرید اگیا۔ بھوکا، ننگا، چیتھڑوں میں لپٹا ہؤا، ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ۔

ٹھاکر صاحب نے حکم دیا "اس کے کپڑے بدلو، خوب کھلاؤ پلاؤ۔ یہ ہیرا کی سواری ہے مضبوط نہ ہوگا۔ تو بوجھ کیسے اُٹھائے گا۔ صاف نہ ہوگا تو ہیرا کو بھی میلا کرے گا۔" راجے کے لئے نائی آیا، خط بنا۔ خاص ٹھاکر صاحب کی پرانی دھوتی پھاڑ کر اس کے لئے دھوتیاں بنیں۔ اور خاصے کا بچا کھچا کھانے کو ملا، اس نے بھی خوب ڈٹ کے کھایا۔ جھوٹا، بچا کھچا، جو کچھ ملا سمیٹ گیا۔ چھ برس تک ایسے اچھے کھانے پیٹ میں نہ گئے تھے۔ اُس نے وہاں پہنچتے ہی ہاتھ پاؤں نکالے راجے

پانچ سات دن کبھی پیٹ کے درد کا کبھی قبض کا، کبھی دستوں کا روگی رہا۔ پھر چند ہی دنوں میں لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو گیا۔

اب اس نے اپنے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ دن بھر یا تو ٹھاکر صاحب اور ٹھکرائن صاحبہ کے احکام بجالاتا، یا کبھی کہار یا مہری کا اس کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔ چار بجے شام سے ہیرا کو لیکر سڑک پر نکلتا۔ اس لڑکے کی قطع "سندبادی تسمہ پا" کی تھی۔ جس وقت سے گودی میں آتا۔ آٹھ بجے رات تک اترنے کا نام نہ لیتا۔ سڑک پر موٹر جاتے دیکھتا تو فرمائش ہوتی ویسے ہی تم بھی چلو۔ راجے منہ سے "پوں، پوں" کرتا۔ اس کے پیچھے دوڑتا۔ اِکّا، تانگا نظر پڑتا۔ تو حکم ہوتا، "منہ میں رسی لو" پھر ٹخ ٹخ کر کے راجے دوڑایا جاتا۔ اگر راجے اس کو لئے ہوئے دو چار دس منٹ بھی بیٹھ جاتا۔ تو وہ شور مچاتا کہ اللہ اکبر۔ بس ایک چیخ اوپر ہوتی۔ ایک نیچے۔ نتیجہ میں راجے دو چار تھپڑ کھاکر رونا، بلکنا، سسکنا۔ اپنے بوجھ کو لادے پھر "پوں پوں" کرتا۔ دوڑتا اور پھر "ٹخ ٹخ" کی آواز پر دلکی چلتا۔ وہ رات کو اتنا تھک جاتا کہ پلنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔ وہ اتنی جلدی سونے پر بھی ڈانٹا جاتا۔ مہربان کہتیں "اچھا یہ بھی لونڈا ہے۔ کہ نیل میں بتی پڑی نہیں۔ کہ اس کی آنکھیں بند ہوئیں نہ تن من کا ہوش، نہ کھانے پینے کے حواس"۔ غرض جھنجھوڑا جاتا، ڈانٹا جاتا تھا۔۔۔

۔۔۔۔۔ پیٹا جاتا تھا، تب جا کے وہ اُٹھ کے رات کو کھانا کھاتا۔ رات کو سونے میں کبھی وہ ماں کو خواب میں دیکھتا۔ کبھی باپ کو، کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ

کھیلتا ہوتا۔ کبھی کسی بھینس کی دم تھامے دوڑتا ہوتا۔ اور کبھی کبھی ہاتھ پاؤں کا درد اور زلزلے کا خوف کسی مہیب دیو یا بھوت کی صورت میں اس پر مسلط ہوتا اور اُس کے ہاتھ پاؤں، اس طرح موڑتا، توڑتا۔ کہ وہ تکلیف سے چیخ اُٹھتا۔ ایسے خوابوں کے بعد وہ اکثر ڈانٹا جاتا۔ اور گالیاں سُنکر چپکا آنکھ بند کر کے پڑا رہتا تھا۔

ہیرا بات بات پر مچلتا تھا۔ دنیا جہان کے لٹو کھلونے۔ جوتے۔ کپڑے۔ موزے، سیٹیاں۔ گیند۔ غلیل۔ چھڑیاں، جو نئی چیز اُس کے سامنے سے گزرتی۔ وہ اُس کے لیئے خریدی جانا ضروری تھی۔ اب اگر ان چیزوں کو رکھ سینت سکتا تھا۔ تو وہ راجے ہی تھا۔ دوسرے کی مجال نہ تھی کہ وہ ہیرا کی کسی چیز کو ہاتھ لگا سکے کسی نے اُن کو چھُوا نہیں۔ کہ ہیرا نے چیخنا شروع کیا۔ اور سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا۔ خود اس کی یہ حالت تھی۔ کہ دو چار ہی منٹ میں ہر چیز سے جی بھر جاتا۔ اور قیمتی ہو یا سستی اس کے پرزے پرزے کر ڈالتا تھا۔ ان لاڈلے کو تو کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ کان گرمائے جاتے تھے۔ تو راجے ہی کے" اس نے آخر کیوں نہ اُن کو توڑنے سے روکا۔ وہ تو بچہ ہی ہے۔ اس کا کام ہی توڑنا پھوڑنا ہے۔ یہ تو سمجھ دار ہے، اس نے کیوں نہیں اس چیز کو بچانے کی کوشش کی۔

غرض سینکڑوں طرح کی مصیبتیں تھیں۔ اور ایک راجے اگر انسان کا بچہ تھا۔ سب جھیل گیا کبھی کبھی اس کا دل بہ ضرور چاہتا۔ کہ ماما، دائیوں کے کوسنے اور ٹھکرائیں

کی ڈانٹ ڈپٹ کا گلہ بہ کلہ جواب دے کبھی وہ سوچتا کہ ٹھاکر صاحب کے گھر کو آگ لگا کر بھاگ نکلے۔ مگر اپاہج ہیرا کے حال پر ترس کھاتا۔ اور خون کے آنسو پی کر رہ جاتا ہیرا سے ہمدردی نے پہلے محبت کی صورت اختیار کی۔ پھر اس محبت نے راجے میں وفاداری، نفس کشی اور اطاعت شعاری کی وہ تمام صلاحیتیں پیدا کر دیں۔ جو غلاموں میں آقاؤں کو پسند ہیں۔

اُس کو اس طرح کی زندگی بسر کرتے ایک سال گزرا، دو سال گزرے، تین سال ہوئے۔ چار سال ہوئے۔ اس درمیان میں اُس نے بچپن کی حدوں سے قدم نکالکر لڑکپن کی حدوں میں قدم رکھا۔ اُس کے جسم کو تھکن بھی محسوس ہونے لگی۔ اور چوٹ بھی۔ اُسے ڈانٹے جانے کا بھی احساس ہونے لگا۔ اور مارے جانے کا بھی۔ اُس کے اعضا میں سختی سی آنے لگی۔ اور اُس کے جسم پر اب کپڑے جلد جلد پھٹنے لگے۔ وہ دوسرے لڑکوں کو اسکول جاتے دیکھتا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، کتابیں اور بستے بغل میں دبائے سائیکل پر یا پیدل چلے جا رہے ہیں، اِس کا جی چاہتا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ جاتا پڑھتا، لکھتا۔ داس کی جگہ بابو جی بنتا، ہمیشہ اُس کو سلام کے لئے نہ جھکنا پڑتا۔ بلکہ دوسرے بھی اُس کو سلام کرتے، اپنا ایک مکان ہوتا۔ آرام سے رہتا۔ نہ کوئی ڈانٹ سکتا۔ نہ مار سکتا ——— دفعتہً ہیرا ایڑ لگاتا۔ "ٹخ ٹخ۔ چل بے گھوڑے چل!"

ایک دن جاڑوں کے زمانے میں جبکہ ٹھاکر صاحب اپنی شہر والی کوٹھی میں تھے۔ مینہ بہت پڑا۔ دن بھر تو نہ ٹھاکر صاحب گھر سے نکلے۔ اور نہ ہیرا ہی اپنی سواری

پر ہوا خوری کر سکا۔ شام کے قریب ذرا پانی بند ہوا۔ بجلی کی چمک' بادل کی گرج پہلے ہی
کی طرح جاری تھی۔ راجے کو حکم ملا ہمیں سڑک پر گھماؤ۔ اس نے سمجھایا "نہیں بھیا بہت مینہ
پڑا ہے' سڑک پر سوائے کیچڑ اور پانی کے کچھ بھی نہیں' یہیں بیٹھے رہو" لیکن بالک ہٹ کے
سامنے ایک نہ چلی۔ ہیرا کو پیٹھ پر لادا۔ اور کوٹھی سے باہر نکلا۔ سڑک پر پانی دیکھتے ہی ہیرا باغ
باغ ہو گیا اڑوس پڑوس کے کچھ لڑکے اس پانی میں دوڑ رہے تھے اور چھینٹوں سے ایک
دوسرے کو رنگ رہے تھے۔ بس مچل گیا تم بھی اسی طرح دوڑو اور مجھے لیکے دوڑو .....
راجے نے دوڑنا شروع کیا۔ چند ہی قدم تیزی سے رکھے ہونگے کہ پاؤں پھسلا اور مع
ہیرا کے سڑک کے اوپر بے تحاشا گرا۔ اس کے کولھے اور ران میں بڑی چوٹ آئی' مگر اس
نے اپنی فکر نہ کی' جلدی سے پلٹ کے ہیرا سے پوچھا "بھیا چوٹ تو نہیں آئی" وہ پہلے
ہی سے بسور رہے تھے' ہمدردی کے سوال نے بھس میں چنگاری کا کام کیا۔ گرجنے
برسنے لگے۔ راجے ان کو چپ کرانے کی کوشش کرتا' لنگڑاتا' پانی اور کیچڑ میں لت
پت کوٹھی پلٹا۔ اس کی یہ صورت دیکھتے ہی گھر بھر میں شور سا برپا ہو گیا۔ مہریوں دائیوں
سے لیکر ٹھاکر ٹھکرانی تک جیسے دیکھئے گالیاں دے رہا ہے اور ہر ایک دو ایک چپت' گھونسے
لات سے ضیافت بھی کرتا جاتا ہے ..... راجے ڈانٹا۔ اور پیٹا جا رہا تھا' وہ
کس سے اپنی بے قصوری بیان کرتا اور کسے اپنی چوٹ دکھاتا؟ وہ رونا سسکتا' اور ڈری
سے کانپتا کمرے کے باہر کھڑا رہا اور وہاں سے اس وقت ہٹا جب اسے ٹھکرائن کا یہ حکم ملا
کہ "جا کے پاجی اپنے کپڑے نہیں بدلتا۔ کھڑا آنسو بہا رہا ہے! جیسے اس سور نے مرے بچے

کے مار ڈالنے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی!"..... اُس نے بھیگی دھوتی اتار کر سوکھی دھوتی اور اپنی چست بنڈی پہن لی لیکن سردی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندر ہی اندر بیٹھا گد گدا رہا ہے، وہ رہ رہ کے جھرجھری سی لے لیتا تھا۔ آخر وہ گھبرا کے چولھے کے پاس چلا، رسوئیا نے دور ہی سے ڈانٹا "دیکھ ادھر قدم نہ رکھنا نہیں تو سب کھانا خراب جائیگا!" وہ ٹھٹھک کے کھڑا ہو گیا۔ گڑگڑا کے بولا "کاکا بڑی سردی لگ رہی ہے!" وہ ترش روئی سے بولا "تو میں کیا کروں چولھے میں سے سب آگ نکال کے تمہیں دیدوں، چل چل بڑا آیا وہاں سے سیٹھ بنکے، جا یہاں سے!"

راجے دھتکارے ہوئے کتے کی طرح وہاں سے پلٹا اور وہاں گیا جہاں ہیرا کی گدے دار مسہری کے پاس اس کا جھنگا پڑا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر گٹھری بن کے لیٹ گیا اور اُس نے اپنے اوپر وہ پھٹا لحاف ڈال لیا جو مالک و مالکہ کی پانچ سات برس تک خدمت کر چکا تھا۔ ... مختلف کاموں کے سلسلے میں جب وہ پکارے جانے پر نہ بولا تو ایک مہری نے کمرے میں جا کر اُس کی حالت دیکھی اور ٹھکرائن کو خبر کی۔ انھوں نے کہا "اسے اسی طرح پڑا رہنے دو، آج رات کھانا نہ دینا۔" رات کو جبکہ سوتا ہوا ہیرا اس کمرے میں منتقل کیا گیا تو راجے کے جھلنگے سے ذرا ہٹ کے میز پر لمپ جلا دیا گیا۔ اس کا بلب زیرو پاور کا تھا۔ یہ رات بھر جلتا تھا کہ کہیں بچہ رات میں جاگ جائے تو اندھیرے سے نہ ڈرے مہری نے جاتے ہوئے پلٹ کے کمرے کی ہر ایک چیز پر نظر ڈالی۔ مسہری پہ ہیرا غافل سو رہا تھا۔ جھلنگے پر راجے پڑا تھا، لمپ جل رہا تھا۔ وہ اطمینان سے باہر چلی گئی ... دو بجے

کے قریب راجے پیاس سے پریشان پسینہ میں تر اٹھا، اُس نے پہلے تو دو ایک بار لیٹے ہی پانی پانی کہا، پھر وہ لحاف پھینک کے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی، وہاں کہیں پانی نہ تھا، وہ لڑکھڑاتا، لنگڑاتا دروازے کی طرف چلا راستے میں اُس کا پاؤں بجلی کے تار میں الجھا۔ اور لیمپ تڑاق سے نیچے گرا۔ ٹوٹتے ہوئے بلب سے ایک شعلہ نکلا اور کمرے کی دری اور راجے کا جھلنگا جلنے لگا۔ وہ "ہائے بھیا" کر کے بلبلا۔ اُس نے لپک کے ہیرا کو اُٹھایا۔ وہ گھبرایا ہوا گردن سے لپٹ گیا، اتنے میں پاؤں میں اُلجھے ہوئے تار میں آگ لگی اور راجے "ہائے" کر کے اچھلا۔ پھر پورے قد سے منہ کے بل دروازے کے رُخ پر گرا۔ اپاہج ہیرا ہاتھ سے چھوٹ کر لڑھکتا دروازے کی چوکھٹ پر سے ہوتا ہوا کمرے کے باہر گرا اور راجے کو آتشیں شعلوں نے زرتار سہرا پہنا دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب سسکتے ہوئے ہیرا نے راجے کی جانبازی کا واقعہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بیان کیا تو ٹھاکر صاحب نے کہا" لڑکا اچھا تھا۔ مرتے مرتے حق نمک ادا کر گیا۔"

ٹھکرائن نے تنک کر کہا" ہونہہ اچھا کیوں نہ ہوتا! چھ برس کی جان کے لئے مٹھی بھر روپیہ نہیں دیا تھا؟"

کیا کیا جائے؟

وہ طبقہ جو "ادنیٰ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

رات کے بارہ بجے ——

رامی۔ ہائے رام! اب تو چھپر میں کہیں لیٹنے کی جگہ نہیں رہ گئی۔ ہر جگہ ٹپک رہا ہے

واسا۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ رات بیٹھے ہی بیٹھے کٹے گی۔

رامی۔ پر ان بچوں کو کیا کریں؟ ان کے سونے کے لئے تو کوئی ٹھور ٹھکانا ہونا چاہیے۔

واسا۔ لاؤ ایک کو ہمیں دے دو۔

رامی۔ کب تک لادے رہوگے۔

واسا۔ جب تک ہو سکے آخر کیا کیا جائے؟

دو بجے رات ـــــ

واسا۔ ہم سے تو اب یہ لونڈا نہیں سنبھلتا۔

رامی۔ تو لاؤ اسے بھی دے دو۔

واسا۔ تم تو چھٹکے کو پہلے ہی سے لئے ہو۔

رامی۔ ہاں۔

واسا۔ تو تم بھی تو تھک گئی ہو گی؟

رامی۔ ہاں۔ پر کیا کیا جائے؟

چار بجے صبح ـــــ

واسا۔ ذرا آگ جلاتیں تو چلم پیتا۔

رامی۔ کیسے جلاؤں؟

واسا۔ لاؤ، بچوں کو مجھے دے دو۔

رامی۔ ان کو لے کے کیا کرو گے؟ دیا بجھ گیا، دیا سلائی سیل گئی، اُپلے بھیگ گئے

واسا۔ پر تماکو پینے کو تو ایسے ہی سے جی چاہتا ہے

رامی۔ ہاں، پر کیا کیا جائے؟

پانچ بجے صبح ـــــ

رامی۔ کہاں جا رہے ہو؟

داسا۔ بیل کو ناند پر لگا دوں، آج کھیت جوتنا ہے نا!

رامی۔ پر ایک بیل سے کیا ہوگا؟

داسا۔ نہیں سکھو سے بھی اس کا بیل مانگا ہے۔

رامی۔ پر یہ دوسروں کے بیل کے سہارے تو کھیتی ہو چکی۔

داسا۔ ہاں، پر کیا کیا جائے؟

سات بجے صبح

رامی۔ ابھی یہ ہل بیل لے کر اتنے سویرے ہی کیسے لوٹے؟

داسا۔ کیا کرتا؟ ایک چوتھائی کھیت پلٹا تھا کہ ضلعدار آ گئے۔

رامی۔ تو ان کا لگان تو دے چکے ہیں۔

داسا۔ ہاں۔ پر اُنھوں نے کہا۔ ہمارا نذرانہ لاؤ۔

رامی۔ اس سمے تو گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔

داسا۔ یہی تو میں نے بھی کہا۔ بس اُنھوں نے کھیت سے نکال دیا۔

رامی۔ پھر کیا کیا جائے؟

نو بجے دن ــــــ

رامی۔ کیا کہا مہاجن نے؟

داسا۔ وہ کہتے ہیں۔ جبتک پچھلا روپیہ نہ دیدو گے۔ ہم ایک پائی ادھار نہ دیں گے۔

رامی۔ ان کو تو کل چار ہی روپیہ چاہیئے تھا۔ اور ہم انھیں سب ملا کے پندرہ اور تین اٹھارہ

روپیہ دے چکے۔

داسا۔ یہی میں نے بھی کہا۔ پر وہ کہتے ہیں۔ یہ سب سُود ہوا۔

رامی۔ ارے رام رے رام، بڑا بے ایمان ہے۔"

داسا۔ ہاں یہ سچ ہے، پر اب تو یہ سوچنا ہے کہ کیا کیا جائے؟

گیارہ بجے دن ــــ

رامی۔ کیا کہا زمیندار نے۔

داسا۔ انھوں نے کہا۔ میں ریاست کے ملازموں کیخلاف ایک بات نہ سنوں گا۔

رامی۔ تو تم نے یہ نہ کہا کہ ہم لگان دے چکے ہیں، ہم کو ایسے سمے کھیت جوتنے سے نہ روکا جائے۔ نہیں تو ہم بھُوکے مر جائیں گے۔

داسا۔ سب کچھ کہا۔

رامی۔ پھر وہ کیا بولے؟

داسا۔ انھوں نے رکھائی سے کہا۔ ضلعدار کا حق نہ دو گے۔ وہ تمہیں کھیت میں گھسنے نہ دیگا۔

رامی۔ تو تم نے کہا نہیں کہ کھیت اس کا نہیں ہمارا ہے۔

داسا۔ میں زمیندار سے لڑنے نہیں گیا تھا۔ اپنی بپتا سنانے گیا تھا۔

رامی۔ ارے تو تم نے کچھ کہا بھی؟

داسا۔ ہاں میں نے خوشامد سے ہاتھ جوڑ کے سب کچھ کہا۔

رامی۔ پھر؟

داسا۔ اُنھوں نے کہا جب تم لوگ ضلعدار دں، کارندوں کو خوش نہ رکھوگے۔ تو یہی ہوگا
بھوکے مرتے ہو تو مجبوری ہے، آخر کیا کیا جائے؟

بارہ بجے دن ـــ

رامی ـــ لے آئے روپے مہاجن سے۔

داسا۔ ہاں لے آیا۔

رامی۔ کتنا دیا اُس نے؟

داسا۔ دس روپے۔

رامی۔ ایں دس ہی روپے! ارے چار چیزیں تھیں! پتاجی تو مجھ سے کہتے تھے۔ کہ
پورے پچاس لگے ہیں ان میں!

داسا۔ پر مہاجن نے کہا۔ میں دس ہی میں لوں گا۔

رامی۔ ہائے بھگوان ہیں لٹ گئی۔

داسا۔ تو اب روتی کیوں ہو، تم ہی نے تو دیا تھا۔

رامی۔ پر میں نے تو اس لئے اپنے کو ننگا کیا تھا۔ کہ مہاجن کا چکا دوگے ضلعدار کو نذرانہ
دوگے۔ اور ایک بیل مول لوگے۔

داسا۔ تو چار مہاجن کو دے کے اس کا حساب چکا دیا۔ دو ضلعدار کو دیدیئے۔ اب
چار ہی روپے بچے ہیں۔

رامی۔ مجھے نہیں چاہیئے تمہارا روپیہ۔ تم میرا گہنا لادو۔

داسا۔ پر اب مہاجن کے پاس جاؤں۔ تو وہ دھتکار دے گا۔

رامی۔ تو اب بیل کہاں سے آئیگا۔ ہائے کھیتی کیسے ہوگی۔ کیا کیا جائے؟

دوسرے دن دوپہر کو ــــــ

داروغہ۔ کیوں جی، یہ چوری تم نے کی؟

داسا۔ ہاں مالک۔

داروغہ۔ تم تو اس کام میں پرانے نہیں جان پڑتے۔

داسا۔ نہیں مالک۔

داروغہ۔ تو تم کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی۔ کہ مہاجن کے گھر میں پھاند پڑے۔

داسا۔ ہجور، اُنھوں نے ہماری جہریا کا سب گہنا پاتا لے لیا اور پچاس کے مال کے دس دیئے

داروغہ۔ تو تم نے بیچا ہی کیوں؟

داسا۔ کیا کرتا مالک؟ ضلعدار کو نذرانہ دینا تھا۔

داروغہ۔ تو تم نے چاہا۔ کہ روپے بھی لے لو۔ اور گہنے بھی چرالو؟

داسا۔ نہیں سرکار، جہریا نے سب چیز بیل مول لینے کو دی تھی۔ وہ رونے لگی۔ کہ بیل لاؤ۔
نہیں تو میرا گہنا لاؤ۔

داروغہ۔ ارے بے وقوف، تو اب تو نہ زیور ملے، نہ روپے ملے اور نہ بیل ملا۔ اگر کچھ ملا
تو مفت کا جیل!

داسا۔ پھر کیا کیا جائے؟ ماں باپ!"

(وہ طبقہ جو اوسط کے نام سے موسوم ہے)

گیارہ بجے رات ـــــ

بڑی بی۔ کیوں بیٹے، کیا پیاس لگی ہے۔

جوان۔ جی ہاں۔ ارے یہ پانی بھی تو کھول رہا ہے! کہیں برف تو نہ ہوگی امی؟

بڑی بی۔ نہیں بیٹا، پیسے کہاں تھے۔ کہ برف آتی۔ تمہارے دونوں بچے بلک بلک کے سو گئے۔ مگر دال روٹی کے سوا ایک پیسہ بھی تو نہ تھا۔ کہ ان کے لئے کباب منگا دیتی

جوان۔ کیا کروں امی؟ اس لُو دھوپ میں دفتر دفتر مارا مارا پھرتا ہوں۔ مگر کہیں نوکری کی صورت نظر نہیں آتی۔

بڑی بی۔ ہاں میاں، آج بہو بھی رونے اور اپنے کو کوسنے لگی۔ کہ میں ہی ایسی پھوٹی تقدیر کی ہوں۔ کہ اچھے خاصے، بی اے پاس اور کہیں نوکری نہیں لگتی۔

جوان۔ تو اس میں ان کا کیا قصور؟

بڑی بی۔ ہے تو ضرور! روٹی تو بیوی ہی کی تقدیر سے ملتی ہے۔

جوان۔ میں ایسی مہمل بات کو نہیں مانتا۔

بڑی بیوی۔ ہے یونہی، اب تم نہ مانو تو کیا کیا جائے؟

بارہ بجے رات ـــــ

بیوی۔ سو گئے؟

جوان - نہیں تو، جاگتا ہوں۔

بیوی - امی سوگئیں؟

جوان - ہاں

بیوی - مجھ سے اب ان کے طعنے برداشت نہیں ہوتے۔

جوان - برداشت کرنا ہی ہیں۔

بیوی - تم کرو، تمہاری ماں ہیں۔ مجھ سے دن رات کٹاری چھری نہیں سہی جاتی۔

جوان - کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو۔

بیوی - تم چاہے بے وقوف سمجھو یا دیوانی، مگر میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ دو ایک دن میں الگ مکان کرو۔ نہیں تو سر پکڑ کر روؤ گے۔

جوان - تم تو نہ سمجھتی ہو نہ بوجھتی ہو۔ بس اپنی ہی بکے جاتی ہو۔ ارے یہ نہیں دیکھتیں کہ کوئی روزگار نہیں۔ نوکری نہیں۔ آمدنی نہیں۔ الگ مکان کیسے کر دوں؟ امی کی بُری زبان سہی پر انھیں کے دس روپے وثیقہ پر سب کا پیٹ پلتا ہے۔ اُن کی باتیں برداشت کرنا ہی ہیں۔ نہ کروگی تو کیا کروگی۔ سوچ لو آخر کیا کیا جائے؟

آٹھ بجے صبح

جوان - امی رات کی روٹی ووٹی کچھ بچی ہو تو دیدیجئے۔ مجھے باہر جانا ہے۔

بڑی بی - مجھ سے کیا مانگتے ہو، بہو سے مانگو۔

جوان - لیکن امی میں تو آج تک آپ ہی کا دیا کھاتا ہوں۔

بڑی بی۔ تو میاں میں اپنی بوٹی کاٹ کے کھلانے سے رہی۔

بچے۔ دادی اماں، ہم بھوکے ہیں۔

بڑی بی۔ تو جاؤ اپنی امی جان کے پاس، وہ الگ گھر کریں گی! لے آتی ہیں۔ بابا جان کے پاس سے گٹھلیاں اور جنگ ونوں میں بھر کے، وہی کھلائیں گی۔

بچے۔ دادی اماں وہ مارتی ہیں۔

بڑی بی۔ تو میرا سر کیوں کھاتے ہو، بابا جان سامنے ہی کھڑے ہیں اُن سے کہو۔

جوان۔ جی چاہتا ہے اپنا منہ پیٹ لوں! ہائے اللہ کیا کیا جائے؟

چھ بجے شام

بڑی بی۔ میاں آج تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ صبح کے گئے اس وقت پلٹے ہو۔

جوان۔ کیا کرتا امی۔ وہ ایک جگہ نوکری کی امید تھی۔ اسی کے لئے دوڑ رہا تھا۔

بڑی بی۔ تو کوئی جگہ ملی؟

جوان۔ جی نہیں۔

بڑی بی۔ بھلا کیسے ملتی ......؟

چھوٹا بچہ۔ اللہ، امی اب کبھی نہ مانگوں گا۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ امی!....

اللہ امی،.... ہائے مرا...... ہوں۔ ہوں۔ ہوں....."

جوان۔ ارے کیا کر رہی ہو بھئی۔ اس بچے نے کیا قصور کیا ہے۔

بہو۔ صبح سے میرا سر کھا رہا ہے کہ مجھے کھانے کو دو۔ یہاں گھر میں چولہا تک نہیں جلا

سمجھا چکی، بجھا چکی۔ کہ میاں جب تک میں پھپھن پیری اس گھر میں ہوں۔ دانہ نصیب نہ ہو گا، مگر مانتا ہی نہیں۔ اب جوتیاں کھائیگا تو یہ تو ٹھیک ہوگا۔

بڑی بی۔ تو کہ توت تو تمہارے خود ہوں۔ اور مارو اس معصوم کو، واہ ری انصاف!

بہو۔ میں تو پھپھن پیری ہوں ہی! نہ معلوم موا موت کا فرشتہ ادھر کی راہ ہی کیوں بھول گیا ہے۔ یا اللہ کسی کی سگی کی آئی ہو میری ہی آ جائے!

بڑی بی۔ آمین، ثم آمین!

جوان۔ ارے یہ دونوں پھر لڑنے لگیں! یا اللہ اب کیا کیا جائے؟

بارہ بجے رات ——

بڑی بی۔ بیٹے بیٹے، جلدی اٹھو، دیکھو تو گھر بھر میں دھواں کیسا بھرا ہے؟

جوان۔ ارے دلھن کہاں ہیں؟

بڑی بی۔ ارے یہ کون کراہ رہا ہے؟

جوان۔ ارے یہ تو کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ احمد کی ماں! احمد کی ماں!

بہو۔ اب کیا کرنے...... آئے ہو...... پھپھن پیری جاتی ہے......"

بڑی بی۔ ارے توڑ ڈالو۔ دروازہ وہ نہ کھولے گی۔

جوان۔ یہ کیا کیا احمد کی ماں تم نے، ہائے اللہ، یہ تو سر سے پاؤں تک جل گئیں!

بہو۔ اُف! اُف! بھکی...... جا رہی ہوں...... اب...... شاید امی کا کلیجہ ...... ٹھنڈا ہو......"

بڑی بی۔ ارے میں نے کیا کیا لوگو کہ مجھے اِس طرح بدنام کرتی ہو!

بہو۔ بھُن۔ پیری! بھُن پیری!۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔!

بڑی بی۔ ارے تم کھڑے منہ دیکھ رہے ہو؟ جلدی جاؤ۔ کسی حکیم ڈاکٹر کو بلا لاؤ!

جوان۔ فیس کے دام کہاں ہیں امّی؟ ہائے کیا کیا جائے میرے اللہ!۔۔۔۔۔۔
کیا کیا جائے میرے خدا!

(وہ طبقہ جو "اعلیٰ" کہلاتا ہے)

دس بجے رات ــــــ

راجہ۔ لائے جی اسے؟

مصاحب۔ سرکار وہ تو نہیں آئیں؟

راجہ۔ کیوں۔

مصاحب۔ سرکار وہ روٹھ گئی ہیں۔

راجہ۔ ارے یہ کیوں؟

مصاحب۔ سرکار سے شاید اُنھوں نے کسی چیز کی فرمائش کی تھی وہ پوری نہیں ہوئی

راجہ۔ ارے میاں تو اُنھوں نے بھی تو حد کر دی۔ کہتی تھیں کہ موتیوں والا ہار دیدو"

مصاحب۔ تو سرکار، دیدیا ہوتا۔

راجہ۔ تم بھی واہی ہوئے ہو، ارے یہاں وہ پُرکھوں کے سمے سے چلا آتا ہے۔ اور اسے
صرف راج کی رانی ہی پہن سکتی ہے۔

مصاحب۔ تو سرکار وہ تو منہ پھلائے بیٹھی ہیں۔ کہتی ہیں۔ جب مہاراج سے ہماری ذری سی فرمائش نہیں پوری کی جاتی۔ تو پھر ہم کیوں ان کے پیچھے اپنی جوانی گنوائیں

راجہ۔ ارے یہ کیا؟ بڑا غضب ہو گیا یار۔ ان کو جس طرح بھی بنے۔ مناؤ بھائی۔ سوچو کوئی تدبیر جلد سوچو! بتاؤ جی، بتاؤ، کیا کیا جائے؟

بارہ بجے رات ———

راجہ۔ لاؤ۔ لاؤ۔ اور دو جی! . . . . بس وہ اسی طرح بھلائی جاسکتی ہیں۔

مصاحب۔ سرکار یہ لال پری دنیا کے غم بھلا دیتی ہے۔

راجہ۔ ٹھیک۔ ک۔ کہتے ہو، بالکل ٹھیک۔ ک۔ ک۔ کہتے ہو، لاؤ۔ ایک . . . . . . ک . . . . ک جام اور دو۔

مصاحب۔ سرکار اب محل میں جانا ہے۔ زیادہ نہ پیجئے۔

راجہ۔ ک۔ ک۔ کیسا محل؟ ک۔ ک۔ کہاں ک۔ ک کا محل! ک۔ ک۔ کون جائے اس چڑیل کی صورت دیکھنے!

چوبدار۔ سرکار اندر بلایا جا رہا ہے۔

راجہ۔ ایں۔ ک۔ ک۔ کیا۔ ک۔ ک۔ کہا؟

چوبدار۔ سرکار اندر سے مہری آئی ہے۔ کہ مہراج کو بلایا جا رہا ہے۔

راجہ۔ ک۔ ک۔ کہہ دو ہم نہیں آئیں گے۔

مصاحب۔ سرکار، سرکار، دیکھئے۔ مہراج۔ ذرا اپنے کو سنبھالئے!

راجہ۔ک۔ک۔کیا بکتا ہے۔ میں ک۔ک۔کیا بہک۔ک رہا ہوں؟

چوبدار۔حضور رانی صاحبہ کہتی ہیں۔کہ اگر آپ نہیں آتے۔تو میں خود آتی ہوں۔

راجہ۔ک۔ک۔کیا وہ یہاں آنے ک ک۔کو۔ک کہتی ہیں؟ یہاں؟

چوبدار۔جی ہاں، مہراج۔

راجہ۔ارے یہ تو۔بڑا رنگ میں بھنگ ہوا۔بتاؤ یارو اب۔ک۔ک۔کیا۔ک۔ک کیا جائے؟

دس بجے دن ——

رانی۔کسی طرح تمہاری نیند آج پوری ہو گی۔یا نہیں، کہ دن بھر سوتے ہی رہو گے؟

راجہ۔اٹھا ہی نہیں جاتا، بدن بھر میں درد ہے!

رانی۔جب رات کو اتنی ڈھیروں پی جاؤ گے۔تو صبح کو یہ حالت ہو ہی گی۔

راجہ۔کچھ ایسی زیادہ تو نہیں پی، اور پھر لچھمی۔۔۔۔۔"

رانی۔ہاں۔ہاں، زبان کیوں دانتوں تلے دبالی؟ کہہ ڈالو! میں کیا جانتی نہیں۔کہ آج کل بی لچھمی کلیجے سے لگی ہیں۔

راجہ۔تمہارے سر کی قسم۔۔۔۔۔"

رانی۔اب میرے سر کو تو مولی گاجر بناؤ نہیں۔اور نہ میں اس سمے اپنے اور تمہارے دکھڑے رونے بیٹھی ہوں، مجھے تو تم سے کنور کے بارے میں کہنا ہے۔

راجہ۔کیا ہوا کنور کو؟

رانی۔ وہ بارہ تیرہ برس کی جو مہترانی کی لڑکی صفائی کے لئے آتی ہے، تم نے دیکھی ہو گی۔

راجہ۔ ہاں، ہاں، وہی نا جو سانولی سی ہے۔ گال پر اس کے تل بہت بھلا۔۔۔

رانی۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ کہ پرجا کی بہو بیٹیوں کے گال کے تل دیکھتے ہو۔

راجہ۔ ارے تمہیں نے تو اس مہترانی کی چھوکری کے بارے میں پوچھا۔ اور پھر لگیں بگڑنے! کیا ہوا آخر اس چھوکری کو؟

رانی۔ جی کنور نے اسے ہماری بہو بنا لیا۔

راجہ۔ ایں! اچھی! اچھی! اچھی! اچھی!

رانی۔ رات مہترانیاں آئی تھیں۔ کہتی تھیں۔ وہ چھوکری اب ہمارے کسی کام کی نہیں رہی۔

راجہ۔ ہے رام، ہے رام، یہ کیا کیا اس لونڈے نے۔ ریاست دیبی پور میں سگائی ہو چکی ہے، یہ بھی نہ سوچا کہ ان لوگوں کو خبر ہو گئی۔ تو کیا ہو گا۔

رانی۔ ابھی تو جا کر اسے بھنگیوں کی پنچایت اور تھانے پولیس سے بچاؤ۔ پھر سوچنا کہ کیا ہو گا ـــــ اور کیا کیا جائے؟

چار بجے شام ـــــ

مینیجر۔ سرکار اتنے روپیوں کا اتنی تھوڑی دیر میں تو کہیں سے انتظام نہیں ہو سکتا۔

راجہ۔ اتنی بڑی ریاست کے مینیجر ہو کے آپ یہ کہتے ہیں؟

منیجر۔ جی ہاں سرکار، لیکن آج ہی کنور صاحب کے معاملے میں پانچ ہزار خرچ ہوئے
وہ تو کہیئے مالگذاری کی رقم رکھی تھی۔ ورنہ اتنے بھی نہ ملتے۔

راجہ۔ اونھ، یہ سب سوچنا آپ کا کام ہے۔ ہمیں نو بجے تک پانچہزار اور ملنا چاہیئے۔

منیجر۔ مگر سرکار، پانچ ہزار چار گھنٹے میں کہاں سے لاؤں؟

راجہ۔ تو اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ آج بھی نہ آئیں وہ۔

منیجر۔ نہ آئیں حضور!

راجہ۔ واہ منیجر صاحب واہ! آپ نے جھٹ سے کہہ دیا کہ نہ آئیں۔ آپ کو کیا معلوم
کہ ہمارے دل پر کیا گزرتی ہے!

منیجر۔ تو اتنے روپے خزانے میں نہیں ہیں، کوئی سیٹھ ساہوکار شام کو روپے دے گا
نہیں۔ بنک بند ہو چکے ہوں گے۔ آخر کیا کیا جائے؟

نو بجے رات ـــــ

راجہ۔ لائے روپیہ منیجر صاحب؟

منیجر۔ ہاں حضور لایا۔

راجہ۔ کتنے ہیں؟

منیجر۔ حضور تین ہزار ہیں۔

راجہ۔ آٹھ آٹھ سات سات ہزار کی نکاسی کے پانچ سات گاؤں اور صرف تین ھزار
وصول ہوئے۔

منیجر۔ حضور، چند گھنٹوں میں اتنا بھی مل جانا بہت ہے۔ اس میں بھی دو ہزار تو قرض ہی لئے گئے ہیں۔

راجہ۔ اچھا خیر، لائیے اتنا ہی سہی اب آپ سے پوری رقم کا انتظام نہیں ہو سکتا تو کیا کیا جائے؟

دس بجے رات ــــــ

راجہ۔ کیا اب بھی نہیں آئیں؟

مصاحب۔ نہیں حضور، وہ کہتی ہیں ہم تو وہی مالا لیں گے۔

راجہ۔ مگر وہ تو میرے پاس ہے بھی نہیں۔ پرسوں سے رانی نے اسے اپنے بکس میں بند کر رکھا ہے۔

مصاحب۔ میں تو حضور کہتا ہوں کہ ان کو چھوڑ ہی دیجئے۔

راجہ۔ ارے میں بے موت مر جاؤں گا۔

مصاحب۔ سرکار، یہ تو جنتریاں ہیں۔ ہمیشہ بدلتے رہنا چاہیئے۔

راجہ۔ ہاں بھئی، مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

مصاحب۔ سرکار کے ایک اشارے پر ان سے سینکڑوں اچھی مل سکتی ہیں۔

راجہ۔ ارے میاں کیا سپنا دیکھتے ہو!

مصاحب۔ نہیں سرکار۔ ابھی کل ہی میں نے وہ پری دیکھی ہے۔ کہ بی لچھمی اُس کے تلوؤں کے برابر بھی نہیں!

راجہ۔ کیا واہی تباہی اُڑاتے ہو!

مصاحب۔ حضور، سچ کہتا ہوں۔

راجہ۔ ارے بھئی کہاں؟

مصاحب۔ حضور کے پڑوس ہی ہیں۔

راجہ۔ اماں نہیں دل لگی کرتے ہو۔

مصاحب۔ نہیں سرکار، میری مجال ہے۔ کہ میں کوئی غلط بات سرکار کے سامنے منہ سے نکال سکوں۔

راجہ۔ تو بھئی ایک نظر ہم کو بھی دکھا دو۔

مصاحب۔ سرکار کا حکم ہو تو یہاں لا کے بٹھا دوں۔ دکھانا کیسا۔

راجہ۔ تو لاؤ، اسی وقت لاؤ!

مصاحب۔ مگر حضور دس ہزار سے کم خرچ نہ ہوں گے۔ کوٹھے پر بیٹھنے والی نہیں ہے، گھر گرہستن ہے اونچے گھرانے کی!

راجہ۔ تو بھئی اس وقت تو تین ہزار ہی ہیں۔

مصاحب۔ تو بقیہ کل پرسوں تک مل جائے سرکار!

ہاں جی، مل جائے گا۔ منیجر انتظام کر کے دیں گے...... تم انھیں لے تو آؤ۔ پچھی نہیں آتیں تو آخر کیا کیا جائے؟

دوسرے دن گیارہ بجے ــــــ

راجہ۔ تم لوگ آخر کیوں آئے ہو؟

رعایا۔ مہراج ہم پر بڑا ظلم ہوتا ہے!

راجہ۔ کیوں، کیوں؟ کیا ہوا؟

رعایا۔ مہراج کل منیجر صاحب نے شام کو ہم لوگوں کو پکڑوا کے بہت پٹوایا۔ ہماری عورتوں کی گردنوں سے ہنسلیاں کھنچوا لیں.....

راجہ۔ تو تم نے ضرور کوئی قصور کیا ہوگا؟

رعایا۔ مہراج ہم لوگوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ ہم لگان دے چکے تھے۔ وہ اگلے سال کا مانگتے تھے۔

راجہ۔ پھر تم نے کیا کیا؟

رعایا۔ مہراج ہم نے کہا۔ ہم کو سمے دیجئے، ہم بندوبست کر دیں گے۔

راجہ۔ مگر روپے کی ضرورت تو اُسی وقت تھی۔

رعایا۔ تو ان داتا ہم بھی انسان ہیں۔

راجہ۔ اس کے کیا معنی؟

رعایا۔ سرکار ہم سونے چاندی کا پیڑ نہیں ہیں۔ کہ جب روپیوں کی ضرورت ہوئی ہمیں پیٹ کے گرا لیا۔

راجہ۔ لیکن میں کہہ تو چکا۔ کہ ہمیں روپیوں کی ضرورت تھی۔ تم جب اپنی خوشی

سے روپے نہیں دیتے۔ تو تمہیں انسان کی جگہ پیڑ اور جانور نہ سمجھ لیا جائے تو کیا کیا جائے؟

کتبہٗ

محمد حسین المعروف "شاہ بونالوی"